تحریر

عظیم آفریدی

(تاریخ کے آئینہ میں)

محمد عظیم آفریدی

باب اول

پٹھانوں کا حسب ونسب

پٹھانوں کے حسب ونسب، رسوم وعادات اور دلچسپ روایات کے متعلق انگریزی، اردو اور پشتو کی سینکڑوں کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے لیکن ان کی نسل کے متعلق آرا میں اختلاف پایا جاتا ہے جسکی بنا پر بعض مورخیں انہیں سامی النسل، آریائی النسل یا یونانی النسل تصور کرتے ہیں. جبکہ دیگر مورخیں انہیں ترک، ایرانی، منگول اور ہندوستان پر حملہ آور اقوام کی ملی جلی نسل سمجھتے ہیں۔

پٹھانوں کی اصل نسل کے متعلق پہلا اور سب سے زیادہ مشہور نظریہ خواجہ نعمت اللہ نے آج سے تقریباً ساڑھے تین سو برس قبل، مخزن افغانی و تاریخ خان جہانی، نامی کتاب میں پیش کیا۔ ان کے کہنے کے مطابق پٹھان بنی اسرائیل کے ان دس قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو بابل کے حکمران. بخت نصر نے. بیت المقدس پر قبضہ. جمانے کے بعد ملک شام سے نکلنے پر مجبور کیا تھا اکثر مورخین جن میں بعض مستشریقین. بھی شامل ہیں اس نظریئے کو بلا تنقید تسلیم کرتے ہیں لیکن نئی تحقیقات کی روشنی میں اس کی تاریخی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ خواجہ نعمت اللہ لکھتے ہیں کہ. بیت المقدس اور شام پر. بخت نصر کے قبضے کے بعد جب بنی اسرائیل ظلم وستم کا نشانہ بنے تو ان کے دس قبیلے ایشیاء کے راستے غور کے پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے اور باقی مکہ معظمہ کے گرد نواح میں قیام پذیر ہوئے۔ چونکہ غور آنے والے قبیلوں کے جدامجد کا نام افغانہ تھا اسلئے وہ افغان کے نام سے مشہور ہوئے۔

خواجہ نعمت اللہ کے نظریئے کی رو سے پٹھان بنیامین بن یعقوب علیہ السلام کی

انتساب

برادران عزیز محمد انور (شہید) اور نور محمد کے نام

نام کتاب ______ آدم خیل آفریدی

مصنف ______ محمد عظیم آفریدی

ناشر ______ رحمان الدین آفریدی

اشاعت ______ ستمبر ۱۹۹۹ء

تعداد ______ ایک ہزار

کمپوزنگ ______ محمد طاہر خٹک

مطبع ______ حمیدیہ پرنٹنگ پریس پشاور

ملنے کا پتہ۔(۱) رحمان الدین آفریدی ضیاء میڈیکل سٹور درہ آدم خیل

(۲) یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور

فہرست

پیش لفظ

سرزمین سرحد اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع، تاریخی اہمیت اور یہاں کے مکینوں کی منفرد نظام زندگی کی وجہ سے عرصہ دراز سے سیاستدانوں، مورخین اور محققین کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور اب بھی ارض پاکستان کا یہ خطہ سیاحوں اور اہل قلم حضرات کیلئے کافی کشش رکھتا ہے۔ آدم خیل آفریدیوں کا علاقہ بھی اس خطے کا ایک حصہ ہے جو اسلحہ سازی کی صنعت کی وجہ سے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی شہرت رکھتا ہے۔

آدم خیل قبائل کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ آفریدی قبیلے کے اس شاخ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی نشیب و فراز دیکھے۔ جارح اقوام بشمول سکھوں اور انگریزوں کا مقابلہ پامردی کے ساتھ کیا اور اپنے خون کی آبیاری سے شمع حریت کو روشن رکھا۔ آدم خیل قبائل نے ان گنت حریت پسند پیدا کئے اور عجب خان جیسے غیور فرزند کو بھی جنم دیا جس کا نام سن کر انگریز کانپ اٹھتے تھے۔ اس خطے نے ایسے ہنرمندوں کو پروان چڑھایا جن کی ذہانت اور فنی مہارت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رفتار زمانہ کے ساتھ یہاں کئی تہذیبیں ابھریں اور مٹ گئیں لیکن صدیاں گزرنے کے باوجود بھی یہاں کے باسی اپنے رسم و رواج اور معاشرتی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گذشتہ نصف صدی میں یہاں اقتصادی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے نتیجے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں انہوں نے پرانی اقدار کی بنیادیں ہلا کر دی ہیں۔ قبائلی بغض و عناد اور خونریز لڑائیوں کا زمانہ گزر چکا ہے۔ بندوق کی جگہ قلم اور عناد کی جگہ صلح اور آشتی نے لی ہے۔ زراعت کے طور طریقوں میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور اب بیلوں کی جوڑی کی بجائے کھیتوں میں ٹریکٹر ہل چلاتے نظر آرہے ہیں۔ دئیے اور لالٹین کی جگہ بجلی کے بلب اور ٹیوب لائیٹ نے لی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ٹیپ رکارڈر کی موجودگی میں حجروں سے رباب کا ترنگ اور گھڑے کا کڑنگ (ٹھاپ) غائب ہو رہا ہے لاؤڈ سپیکر کے استعمال نے غمی اور خوشی کی تقریبات میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شمولیت یقینی بنادی ہے۔ ننواتے سے متعلق کئی پرانے رسوم معدوم ہو چکے ہیں۔ نظام جرگہ جو سستے انصاف کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ تھا، نہایت کٹھن مراحل سے گزر رہا ہے اور بد عنوان عناصر کی وجہ سے اس صدیوں پرانے نظام کو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ اس سائنسی دور میں لوگوں کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے قبائلی روایات کو ایک تاریخی دستاویز کی شکل میں محفوظ کرنے کی ضرورت بڑھ گئی ہے تاکہ مستقبل کے مورخ قبائلی معاشرہ میں روپذیر تبدیلیوں کا بخوبی اندازہ لگا سکیں۔ اسلئے اس کتاب میں بعض ایسی رسومات کا تذکرہ کیا گیا ہے جو یا تو زوال پذیر ہیں اور یا متروک ہو چکی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آدم خیل کے مخصوص روایات کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں مطبوعہ مواد سے زیادہ غیر مطبوعہ مواد پر انحصار کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تکمیل میں جن حضرات نے میری مدد اور رہنمائی کی میں ان کا تہہ دل سے مشکور رہوں خاص طور پر میں صوبہ سرحد کے سابق ایڈیشنل چیف سکرٹری جناب مسعود الرؤف (مرحوم) کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھے سول سکرٹریٹ صوبہ سرحد کی بعض پرانی فائلوں سے استفادہ کرنے کی اجازت دے کر میرے کام کو سہل اور آسان بنایا۔
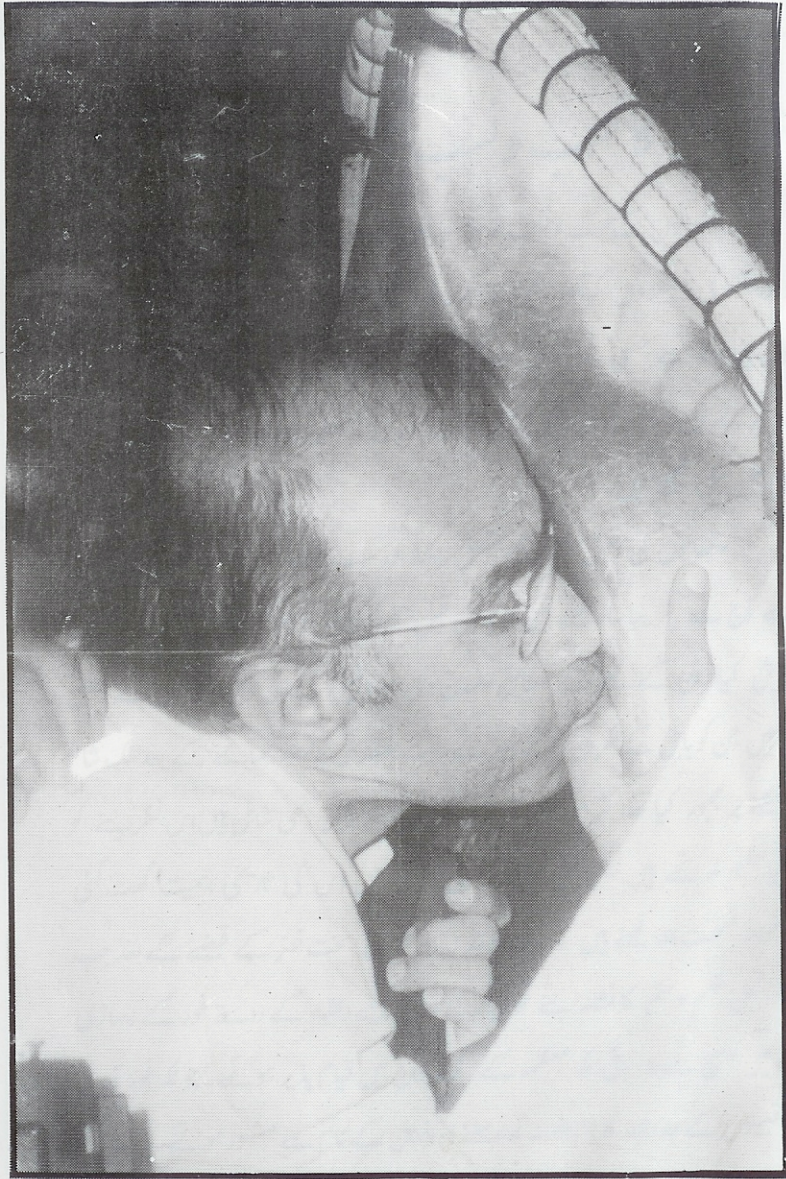
شاید ان کی علم دوستی کے بغیر یہ کتاب اس صورت میں منظر عام پر نہ آتی۔ میں پشاور یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابقہ چیرپرسن ڈاکٹر لعل بہا علی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اسلحہ سازی سے متعلق لندن سے لائے ہوئے غیر مطبوعہ تاریخی مواد سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ میں ٹرائیبل ریسرچ سل اور ڈائرکٹریٹ آف آرکائیوز کے حکام کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے تاریخی مواد کے سلسلہ میں میری ہر ممکن مدد اور معاونت کی۔ اس کتاب کی اشاعت میں گہری دلچسپی لینے پر میں ضیاء میڈیکل سٹور کے پروپرائٹر جناب رحمان الدین آفریدی کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

عظیم آفریدی

مصنف حجر اسود کا بوسہ لینے کی سعادت حاصل کررہے ہیں

اولاد میں سے ہیں بنیامین کے ایک پوتے کے ہاں ساول نامی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو اپنی وجاہت کی وجہ سے طالوت کے نام سے مشہور ہوا۔ طالوت اپنی گونا گوں خوبیوں اور خداداد قابلیت کی بدولت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا اور اس نے اپنی سلطنت میں قابل، دیانتدار اور مخلص افراد کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا حضرت داؤد علیہ السلام بھی ایسے سر بر آوردہ افراد میں شامل تھے جنہیں طالوت نے ایک بڑے علاقے کا انتظام سونپا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی قابلیت، انتظامی صلاحیتوں اور حسن کار کردگی سے طالوت اتنا متاثر ہوا کہ انہیں نہ صرف ایک اعلیٰ عہدہ بخشا بلکہ اپنی ایک لڑکی بھی ان کے نکاح میں دی۔

طالوت نے دو شادیاں کی تھیں لیکن اپنی زندگی میں وہ اولاد نرینہ سے محروم رہا البتہ وفات کے بعد اس کے دونوں بیواؤں کے ہاں ایک ایک لڑکا پیدا ہوا ان میں سے ایک کا نام برقیا اور دوسرے کا نام آرمیا رکھا گیا۔ طالوت کی وفات کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بنی اسرئیل کے بادشاہ بنے تو انہوں نے طالوت کی بیواؤں کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ کیا اور برقیا اور آرمیا کے جوان ہونے پر انہیں اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا۔ شادی کے بعد برقیا کے ہاں آصف اور آرمیا کے ہاں افغانہ پیدا ہوا۔ جب آصف اور افغانہ جوان ہوئے تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے (جو حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد بنی اسرئیل کے بادشاہ بنے) انہیں ان کے والدین کے عہدوں پر فائز کیا۔ افغانہ کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا اور بیت المقدس کی ازسرنو تعمیر کا کام بھی اسی کو سونپا اسی طرح آصف کو وزیر اعظم کے عہدے پر متمکن کیا گیا۔ افغانہ کو خدا نے چالیس (۴۰) اور آصف کو اٹھارہ (۱۸) لڑکے عطا کئے اور بعد میں ان کی اولاد میں اتنا اضافہ ہوا کہ قبیلہ افغانہ کا شمار بنی اسرائیل کے اہم قبیلوں میں ہونے لگا۔ اس نظریئے کی تائید میں جے۔ پی۔

فیرائر لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرئیل افراتفری کا شکار ہو گئے۔ بخت نصر نے بیت المقدس فتح کرنے کے بعد ستر (۷۰) ہزار یہودیوں کو تہ تیغ کر ڈالا اور بہت سوں کو قیدی بنا کر بابل پہنچایا۔ قبیلہ افغانہ کے لوگ قتل عام کے خوف سے جدہ سے عرب آئے لیکن چراگاہوں اور پانی کی کمی کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا اس قبیلے کا ایک خاندان جو ابدالی کے نام سے مشہور تھا ملک عرب میں رہنے لگا اور حضرت ابو بکر کے دور خلافت میں اس خاندان کے افراد حضرت خالد بن ولید کے حلیف بنے۔ جب عربوں نے ایران فتح کیا تو ابدالی ایران آئے اور کرمان اور فارس کے صوبوں میں سکونت اختیار کی اور یہاں چنگیز خان کے حملے تک مقیم رہے۔ ابدالیوں کی آمد سے قبل تمام افغان منتشر تھے لیکن کوہ سلیمان میں ابدالیوں کی آمد کے ساتھ ہی وہ یکجا ہونا شروع ہوئے اس وقت یہ چالیس (۴۰) قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے[1]

خواجہ نعمت اللہ کے بیان کے مطابق بخت نصر کے حملے کے بارہ (۱۲۰۰) سو سال بعد جب دنیائے عرب اسلام کی روشنی سے منور ہونے لگی تو اس وقت افغانہ کی اولاد غور کے پہاڑی علاقے میں مقیم تھی اور قیس ان کا سردار تھا جس کا شجرہ نسب چونتیسویں (۳۴) پشت میں افغانہ بن آرمیا، سینتیسویں (۳۷) پشت میں طالوت، بیالیسویں (۴۲) پشت میں حضرت یعقوب علیہ السلام، پینتالیسویں (۴۵) پشت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تریسٹھویں (۶۳) پشت میں حضرت آدم علیہ السلام سے ملتا ہے[2] لیکن تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ شجرہ نسب اسی بنا پر مشتبہ سمجھا جاتا ہے کہ تورات میں طالوت کا جو شجرہ دیا گیا ہے اول تو وہ خواجہ نعمت اللہ کے دیئے ہوئے شجرے سے مختلف ہے دوسرے یہ کہ ایک صدی میں عموماً چار پشتیں گزرتی ہیں اور اسی حساب سے ساول اور قیس کے درمیان سینکڑوں برس کا فرق

پڑتا ہے خاص طور پر موہن لعل اس بات پر معترض ہے کہ سولہ سو سال کے عرصہ میں سینتیس (۳۷) پشتیں کیسے گزر سکتی ہیں۔[3]

ظہور اسلام کے بعد پہلے پہل رسول اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم ملک عرب میں اسلام کی تبلیغ میں مشغول رہے لیکن صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے اقوام عالم کو اسلام کی دعوت دی۔ حضرت خالد بن ولید کا نام بھی ان افراد میں شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے افغانہ کی اولاد کو اسلامی برادری میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ خواجہ نعمت اللہ کے بیان کے مطابق حضرت خالد بن ولید نے ایک خط کے ذریعے قیس اور افغانہ قبیلے کے دیگر زعماء کو اسلامی برادری میں شامل ہونے کی دعوت دی جس کے جواب میں قبیلہ افغانہ کا ایک وفد قیس کی سر کردگی میں مدینہ منورہ روانہ ہوا۔ مدینہ میں اپنے قیام کے دوران قیس اور اس کے وفد کے ارکان مسلمانوں کے اخلاق حسنہ اور اسلام کے زرین اصولوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ قیس چونکہ یہودی نام تھا اس لئے پیغمبر اسلام نے اس کو عبدالرشید کا نام دیا اور ملک کے خطاب کے ساتھ ساتھ اسے بطحان کا لقب بھی عطا کیا لیکن اس روایت کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ اتنے بڑے واقعے کا ذکر نہ کسی حدیث اور نہ کسی پرانی اور مستند کتاب میں ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قیس عبدالرشید فتح مکہ کے موقع پر اسلامی لشکر میں شامل تھے اور اس کی بہادری سے خوش ہو کر نبی کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہذا بطحان دینی۔ بطحان عربی میں کشتی کے نچلے پشتے کو کہتے ہیں جو کیڑا لگنے سے محفوظ رہتا ہے[4] رسول مقبول صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب لیا گیا ہے کہ یہ میرے دین کی جڑ ہیں یعنی یہ اتنے راسخ العقیدہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنے عقیدے سے نہیں بھٹکایا جا سکتا بعض

مورخین کے مطابق یہی بطحان کا لفظ بعد میں پٹھان میں تبدیل ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لفظ پٹھان، پٹ آن کا مجموعہ ہے جس کے معنی بے دخل کرنے کے ہیں چونکہ ہندوستان پر اپنے حملوں کے دوران پٹھانوں نے بعض مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو بے دخل کیا تھا اس لئے وہ پٹھان کے نام سے مشہور ہوئے۔[5] مورخین یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ فاتح یا فاتحان کا لفظ پٹھان میں تبدیل ہوا ہے بعض اہل الرائے کے خیال میں پٹھان پٹنہ شہر کی مناسبت سے پٹان مشہور ہوئے کیونکہ شیرشاہ سوری نے یہاں اپنے قبیلے کے لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے بعد بنگال پر چڑھائی کی تھی ساتھ ہی یہ رائے بھی ظاہر کی گئی ہے کہ اہل ہندافغانوں کو اس لئے پٹھان کہنے لگے کہ یہ قوم دشمنوں کی لڑائی میں آ کر پتھیہ جاتی تھی (یعنی پیس جاتی تھی) اس واسطے اس کا نام پتہان سے پٹھان بن گیا۔[6] پختونوں کیلئے پٹھان کا لفظ عہد مغلیہ کے مورخین اور خاص طور پر فرشتہ نے سولہویں صدی عیسوی میں استعمال کیا ہے۔ بقول محمد حیات خان پٹھانوں کے مورث اعلیٰ قیس عبدالرشید غور میں پشت کے مقام پر سکونت پذیر تھے اس لئے اس جگہ کی مناسبت سے یہ قوم پشتون کے نام سے مشہور ہوئی۔

پٹھانوں کی تاریخ کی کڑیاں جوڑتے ہوئے خواجہ نعمت اللہ رقمطراز ہیں کہ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران خالد بن ولید نے اپنی لڑکی بی بی سارہ کی شادی قیس سے کر دی۔ (آ) مدینہ سے واپسی پر قیس عبدالرشید غور اور اس کے قرب وجوار میں اسلام کی تبلیغ میں

(آ) پٹھان خالد بن ولید کی اولاد کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں بہادری حضرت خالد بن ولید سے ورثے میں ملی ہے۔

مصروف ہو گئے اور اس کے ہاں سڑبن، بٹن اور غور غشت نامی لڑکے پیدا ہوئے۔ قیس کے ان لڑکوں کی اولاد ۲۷۷ قبیلوں پر مشتمل ہے لیکن ان کے علاوہ ۱۲۸ خیل ایسے ہیں جو پٹھان سمجھے جاتے ہیں اس طرح پٹھان قبیلے کے کل خیلوں یا شاخوں کی تعداد ۴۰۵ تک پہنچتی ہے جن میں ۱۰۵ خیل سڑبن، ۷۷ خیل بٹن اور ۲۲۳ خیل غور غشت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ غور غشت کے ۲۲۳ خیلوں میں سے ۱۲۸ خیل کرلانڑی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں[7]۔

سڑبن کے دو بیٹوں شرخبون اور قرشبون سے ابدالی (درانی) ترین، شیرانی، صدوزئی، یوسفزئی، شنواری، خلیل، مہمند، داؤدزئی، گگیانی، چمکنی اور مشرقی اور مغربی اطراف میں بسنے والے پٹھان قبیلے پیدا ہوئے۔ جبکہ بٹن کے دو لڑکوں اور ایک لڑکی سے بھٹنی، دوتانی، غلجی، مروت، نیازی اور لودھی پٹھان پیدا ہوئے۔ قیس کے تیسرے لڑکے غور غشت سے صافی اور جدون اور ژوب اور بلوچستان کے کاکڑ اور دیگر قبیلے پیدا ہوئے۔ خواجہ نعمت اللہ نے آفریدی، محسود، وزیر، بنگش، خٹک، اورکزئی، اتمان خیل اور دیگر کرلانڑی پٹھانوں کا تذکرہ قیس کے مذکورہ بیٹوں کی اولاد سے علیحدہ کیا ہے لیکن ابوالفضل اور ایلفنسٹن کرلانڑ کو قیس کا چوتھا بیٹا قرار دیتے ہیں[8]۔ جناب روشن خان جنہوں نے تواریخ حافظ رحمت خانی ترتیب و حواشی کے ساتھ شائع کی ہے اور اپنے دلائل کی حمایت میں نہ صرف تاریخی کتب بلکہ علماء و مشائخ کے حوالے بھی دیئے ہیں پٹھانوں کی سامی النسل ہونے کے نظریئے کی پر زور حمایت کی ہے اسی طرح قاضی عطاءاللہ بھی سامی النسل نظریئے کی ہمنوائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مورخین کے خیال میں پٹھان بنی اسرائیل ہیں۔ پٹھانوں کی عادات واطوار، شکل وشباہت اور طرز معاشرت بھی بنی اسرائیل جیسی ہے آج بھی پٹھانوں کے علاقہ میں بعض دیہات اور پہاڑوں کے نام بنی اسرائیل کے پہاڑوں اور دیہاتوں کے نام

سے ملتے جلتے ہیں چنانچہ خیبر جو عرب میں یہودیوں کا ایک مشہور مقام تھا پٹھانوں کے علاقہ میں آفریدیوں اور شنواریوں کے ایک علاقے کا نام ہے۔ صدوم (صودم) یوسفزیوں کے ایک علاقے کا نام ہے اسی نام پر بنی اسرائیل کا ایک شہر آباد تھا۔ اسی طرح لفظ جلیل اور جلالہ گلیلی سے نکلے ہوئے ہیں جو فلسطین کی ایک مشہور جھیل ہے اور کوہ سلیمان بھی یہودیوں کے ایک بڑے بادشاہ اور پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے نام پر مشہور ہے۔ عرب ابتداء میں پٹھانوں کو سلیمانی کہتے تھے لیکن پٹھانوں نے اپنے لئے ہمیشہ پختون کا لفظ استعمال کیا ہے[9]"۔

سامی النسل نظریئے کی حمایت میں ایک اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ ۱۷۳۹ء میں ایران کا بادشاہ نادرشاہ جب ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے پشاور پہنچا تو مقامی لوگوں نے اسے عبرانی زبان میں تورات کا ایک تحریر شدہ نسخہ پیش کیا اور چند ایسی چیزیں بھی دکھائیں جو یہودیوں سے متعلق تھیں نادر شاہ کی فوج میں شامل یہودیوں نے ان چیزوں کی شناخت کی اور یوسفزیئوں کے یہودی النسل ہونے کی تصدیق کی[10] لیکن اس دلیل کو ایک مفروضے سے زیادہ وقعت حاصل نہیں کیونکہ نادرشاہ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھا اور اگر اسے خوش کرنا ہی مقصود تھا تو یہودی مخطوطے کے بجائے اس کے عقیدے کے مطابق کوئی متبرک چیز پیش کرنا بہتر ہوتا۔ الحاج خانمیر ہلالی اس مفروضے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نادرشاہ شیعہ تھا اور یوسفزئی سنی العقیدہ۔ اگر یوسفزئیوں کو یہ خدشہ ہوتا کہ کہیں نادرشاہ انہیں تاخت و تاراج نہ کرے تو اسے امام رضا یا امام کاظم کی کتاب پیش کرنی چاہئیے تھی[11] اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر بیلیو معترض ہیں کہ اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہلوانے

سے پٹھانوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ جبکہ انکی نظر میں کسی کو یہودی کہہ دینا بد ترین گالی سمجھا جاتا ہے۔[12]

سر ولیم جونز، ایچ ڈبلیو بیلیو، ٹی ایل پینل اور بعض دیگر یورپی مورخین خواجہ نعمت اللہ کے اس نظریئے کی تائید کرتے ہیں کہ پٹھانوں کا تعلق ان دس اسرائیلی قبیلوں سے ہے جنھوں نے ہزارہ جات (غور) میں پناہ لی تھی اور اس لئے بنی اسرائیل اور افغانوں کے خدو خال، شکل وصورت اور رسوم و عادات ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں[13] افغان اسرائیلیوں کی طرح دراز قد ہیں اور چہرے کی ساخت کے لحاظ سے ان سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان میں مروجہ نام جیسے ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، داؤد، یوسف، یعقوب اور سلیمان وغیرہ اسرائیلیوں کے ناموں سے ملتے ہیں لیکن اس نظریئے کے ثبوت میں ماسوائے خدوخال کی یکسانیت، عبرانی ناموں اور چند دیگر خصوصیات کے اور کچھ نہیں پیش کیا جاسکتا۔ یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ شکل وشباہت، عادات و اطوار کی بنیاد پر ایک قوم کا نسلی رشتہ دوسری اقوام سے نہیں جوڑا جاسکتا مثال کے طور پر آریائی اور سمیری اقوام کے لوگوں کے خدوخال ایک دوسرے سے ملتے ہیں لیکن اس مشابہت کے باوجود وہ بلحاظ نسل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کشمیریوں کی شکل وشباہت بھی پٹھانوں سے ملتی ہے لیکن نسلی اعتبار سے ان دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں[14]

اگر رسوم ورواج اور جسمانی ساخت میں یکرنگی سے کسی قوم کی اصل نسل کا تعین ہو سکتا ہے تو پھر پٹھان یا تو عربی النسل ہیں اور یا یونانی النسل۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر اعظم کے حملے سے قبل یونانی وادی گندھارا میں مقیم تھے اور جب سکندر اعظم نے سوات پر حملہ کیا تو نائیسا کے یونانی النسل لوگوں نے نہ صرف اسے

یونانی زبان میں خوش آمدید کہا بلکہ تین سو (۳۰۰) مسلح گھڑ سواروں پر مشتمل ایک دستہ بھی فراہم کیا۔[15] سکندر اعظم کی واپسی کے بعد بھی یونانی کافی عرصہ تک افغانستان اور وادی گندھارا پر حکمران رہے اور قبائلی علاقہ میں اس وقت جو قلعہ نما مکانات دکھائی دیتے ہیں وہ بعض مورخین کے نزدیک یونانیوں کے دور حکومت کے آثار ہیں۔ پٹھانوں کی روایتی بہادری کے بارے میں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ یہ انہیں یونانیوں سے ورثے میں ملی ہے۔ شوکت افغانی کے مصنف بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ افغان ان فوجیوں کی اولاد ہیں جو سکندر اعظم کے ہمراہ افغانستان آئے اور بعد از فتح یہاں سکونت اختیار کی یا یہ ان نو آباد لوگوں کی نسل ہے جو سکندر اعظم کے جانشینوں کے عہد میں یونان سے آکر افغانستان میں آباد ہوئے۔ قدیم یونانیوں اور پٹھانوں کی طرز معاشرت میں بھی کئی قدریں مشترک ہیں۔ یونانی معاشرے میں محبت کی شادیاں ناپید تھیں اور پٹھانوں کی طرح رشتے والدین کی مرضی سے طے کئے جاتے تھے۔[16] یونانی خواتین کی سماجی حیثیت ہماری قبائلی خواتین سے زیادہ مختلف نہیں تھی ان کا دائرہ کار گھر کی چاردیواری تک محدود تھا اور وہ مردوں کے سماجی مشاغل میں حصہ لینے سے احتراز کیا کرتی تھیں۔ یونانی معاشرہ میں منگنی بیاہ وغیرہ بھی والدین کے مرضی کے مطابق کی جاتی تھی اور پٹھان معاشرہ میں اب بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ لڑکا ہو یا لڑکی ان کی ازدواجی زندگی کی قسمت کا فیصلہ والدین ہی کرتے ہیں۔

پٹھانوں کے یونانی النسل ہونے کے نظریئے کے سر گرم حامی غنی خان کے خیال میں پٹھانوں کی رسوم وعادات یونانیوں سے ملتی جلتی ہیں پٹھان یونانیوں کی طرح بلند پایہ شاعر، بہادر اور جنگجو ہیں اور یونانیوں کی طرح ان کی لڑائیاں بھی خواتین پر ہوئی ہیں۔[17] اسی طرح پٹھانوں اور عربوں کے قبائلی نظام میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ دوستی، دشمنی،

بہادری، بے باکی، مہمان نوازی اور حب الوطنی میں پٹھان کسی لحاظ سے بدوی عرب قبائل سے کم نہیں۔ ضیافہ (مہمان نوازی)، حماسہ (قوت برداشت) مروہ (جرأت اور بہادری) عرض (عزت) عربوں کی شہرت کی حامل خصوصیات تھیں[18] اور یہی خوبیاں پٹھان معاشرہ میں پختونولی کی بنیاد سمجھی جاتی ہیں۔ عربی زبان میں "خیل" گروہ کو کہتے ہیں اور یہی لفظ پٹھانوں کے قبائلی نظام کا محور ہے اور ان کے مختلف قبیلوں کی شاخوں کے نام "خیل" سے شروع ہوتے ہیں اسی طرح پشتو لفظ مشر شاید عربی لفظ مشیر سے مشتق ہے جس کے معنی صلاح کار کے ہیں۔

ان حقائق سے قطع نظر محققین اور خاص طور پر اولف کیرو اور سید بہادر شاہ ظفر کاکاخیل خواجہ نعمت اللہ کے نظرئیے کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظریہ حقائق سے زیادہ مفروضات پر مبنی ہے اس نظرئیے کے خالق نے نہ تو اپنے دعوے کے ثبوت میں تاریخی اور مستند حوالے دئیے ہیں اور نہ وہ پردہ چاک کیا ہے جس نے بخت نصر کے حملے سے ظہور اسلام تک پٹھانوں کی تقریباً بارہ سو (۱۲۰۰) سالہ تاریخ کو نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کاکاخیل تورات کے حوالوں کی روشنی میں خواجہ نعمت اللہ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کرتے کہ ساول نے بخوشی اپنی سلطنت داؤد علیہ السلام کے حوالے کی تھی اور اپنے بیواؤں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی انہیں سونپی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ساول کے خاندان کے مابین ساڑھے سات سال تک لڑائی جاری رہی جس کے نتیجہ میں ساول کا خاندان کمزور اور مغلوب ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ ساول کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اشبوست یہودا قبیلے کے علاوہ دوسرے اسرائیلی قبیلوں کا بھی

بادشاہ بن گیا۔ اسی طرح تورات کے مطالعہ سے کہیں بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ آصف بن برقیا حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر اعظم اور افغانہ بن آرمیاان کے سپہ سالار تھے[19]۔

اولف کیرو نے محمود غزنوی کے عہد کے دو مورخین العتبی اور البیرونی کی کتابوں کے مندرجات کی روشنی میں اس دعوے کو باطل قرار دیا ہے کہ قیس کی دعوت پر تمام پٹھانوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دسویں صدی عیسوی کے آخر تک کابل سے پشاور تک علاقے پر ایک ہندو راجہ حکمران تھا اس کے علاوہ بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان جو لڑائی ہوئی تھی اس میں پٹھانوں نے دونوں طرف سے حصہ لیا تھا[20]۔ پٹھانوں کی اس نااتفاقی سے یہ اندازہ با آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے آخر تک انہوں نے بحثیت مجموعی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف فرشتہ کا بیان ہے کہ معزالدین محمد بن سام (محمد غوری) کا لشکر ترکوں، تاجکوں اور افغانوں پر مشتمل تھا اور اس کے ہندی مدمقابل پتھورائے (پرتھوی راج) نے راجپوت اور افغان سواروں کا لشکر اکٹھا کیا تھا گویا ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس جنگ میں افغانوں کے نمائندے دونوں طرف سے لڑتے دکھائے گئے ہیں جس سے غالباً یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس وقت تک سب افغانوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا درحقیقت یہاں اسلام غزنوی اور غوری دور حکومت میں عرب مشائخ اور مبلغین کی آمد سے پھیلنا شروع ہوا۔ ان حقائق سے قطع نظر یہ سوال بھی توجہ طلب ہے کہ آخر وہ کونسی کشش تھی جس نے اسرائیلی قبیلوں کو عراق اور ایران کے سرسبز و شاداب علاقوں سے کوچ کرنے اور غور کے پہاڑی علاقہ میں آبسنے پر آمادہ کیا تھا۔ خواجہ نعمت اللہ کے نظرئیے سے خاص طور پر مندرجہ ذیل خامیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

(۱) تورات میں طالوت کا جو شجرہ نسب دیا گیا ہے وہ خواجہ نعمت اللہ کے دیئے گئے شجرہ نسب سے مختلف ہے۔

(۲) خالد بن ولید قریش کے بنو مخزوم قبیلے نہ کہ یہود قبیلے سے تعلق رکھتے تھے

(۳) گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں محمود غزنوی اور آنند پال اور بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں محمد غوری اور پرتھوی راج کے درمیان لڑائیوں میں پٹھان دونوں طرف سے لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک پٹھانوں نے من حیث القوم اسلام قبول نہیں کیا تھا۔[21]

(۴) ماہرین لسانیات کے مطابق پشتو اور عبرانی زبان میں زمین و آسماں کا فرق ہے اور اس تفاوت سے بنی اسرائیل اور پٹھانوں کے نسلی تضادات کا پتہ چلتا ہے۔

پٹھانوں کے متعلق دوسرا مشہور نظریہ یہ ہے کہ وہ اریائی النسل ہیں اور آریائی قبائل کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندو یورپی آریاؤں کے نام سے مشہور ہیں۔ اس نظرئیے کی اساس لفظ پختون اور پشتو زبان کی تحقیق پر رکھی گئی ہے۔ احمد علی کہزاد اور بعض دیگر مورخین پٹھانوں کے آریائی النسل ہونے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آریاؤں کی مذہبی کتاب رگ ویدہ میں ایسے قبائل کے حوالے دئے گئے ہیں جو پٹھان قوم اور اس کی جائے سکونت سے متعلق ہیں اسی سلسلہ میں رگ ویدہ کے پکھت موجودہ دور کے پٹھان سمجھے جاتے ہیں اور ان کی زبان بھی آریائی زبان سمجھی جاتی ہے۔ راورٹی، گریئرسن، ڈاکٹر ٹرمپ اور بعض دیگر ماہرین لسانیات تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پشتو زبان گرائمر

کے قواعد اور الفاظ کی ساخت کے اعتبار سے عبرانی نہیں بلکہ ایک آریائی زبان ہے[22] اسی طرح پروفیسر ڈاؤسن اور ڈاکٹر شاہد اللہ کو بھی پشتو میں عبرانی کی نشانیاں نظر نہیں آتیں۔[23] آریائی النسل نظرئیے کی حمایت میں بعض مورخین پٹھانوں کے شادی بیاہ کے رسوم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شادی کے موقع پر دلہن کے سر کے بالوں کو دو برابر حصوں میں منقسم کرنا اور اس میں سندور لگانا بنیادی طور پر آریائی رسم ہے اسی طرح پٹھانوں کے کھیل بالخصوص آنکھ مچولی (پٹ پٹونے) ایک آریائی کھیل ہے اور اب بھی یہ اور بعض دیگر آریائی کھیل ایران، بھارت اور پاکستان میں کھیلے جاتے ہیں اور یہی آریائی رسوم اور کھیل پٹھانوں کی آریائی النسل کی دلالت کرتے ہیں۔

پٹھانوں کے متعلق تیسرا نظریہ یہ ہے کہ یہ مخلوط النسل ہیں اور ان میں مختلف اقوام کا خون شامل ہے اسی ضمن میں فریز رٹائٹلر لکھتے ہیں کہ پٹھانوں کی اصل نسل کے متعلق ایک مشہور روایت یہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل قبیلہ کے قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں لیکن چہرے کے خدوخال کی مشابہت اور بعض حالات میں ناموں کی یکسانی اور چند دیگر اوصاف کے علاوہ اس کہانی کی سچائی کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا اس کے برعکس پشتو زبان عبرانی اور آرمینی زبانوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کا خیال ہے کہ پٹھانوں میں ایرانیوں، ترکوں اور منگولوں کے خون کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ لانگ ورتھ ڈیمز اور سرہربنٹ ریزلے بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ پٹھان ترک یا ایرانی النسل ہیں اور ان میں ترکی عنصر زیادہ غالب اور نمایاں ہے۔ اسی طرح فارغ بخاری اور رضا ہمدانی تحقیق کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پٹھانوں میں عربوں، منگولوں، ترکوں اور یونانیوں کا امتزاج ہے ان کے کہنے کے مطابق "پٹھان آرین ہوں یا اسرائیلی لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ ایک

قبیلے کے افراد نہیں معلوم ہوتے ایسا لگتا ہے کہ ان میں مختلف قومیں آآ کر ملتی رہی ہیں کیونکہ ان کے حلئے، قد قوارے، رنگ و روغن، اطوار و عادات، رسم ورواج، زبان اور لہجے کا اختلاف ہمیں یہ ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ ان میں عربوں، منگولوں، ترکوں اور یونانیوں کا امتزاج ہے جو مختلف اوقات میں آآ کر ان میں مدغم ہوتے رہے اور عہد اسلام میں جب اس تمام مجموعے نے اسلام قبول کرلیا تو مذہباً وہ ایک ہی رنگ میں رنگے گئے۔[۲۵]" ان متضاد آرا کی موجودگی میں پٹھانوں کی اصل نسل کی گتھی الجھی ہوئی نظر آتی ہے اور اصلی حقائق جاننے کیلئے اسی سلسلہ میں مزید تحقیق اور عمیق مطالعے کی ضرورت ہے۔

باب دوم

آفریدی

آفریدی پاکستان کے شمال مغربی سرحد پر رہنے والے قبائلی پٹھانوں کا ایک بڑا قبیلہ ہے جسے درہ کوہاٹ اور خاص طور پر تاریخی درہ خیبر کی وجہ سے اہم مقام حاصل ہے ان دو دروں کے پاسباں کی حیثیت سے آفریدی برصغیر جنوبی ایشیاء کے حکمرانوں سے وقتاً فوقتاً مواجب وصول کرتے رہے ہیں۔ آفریدی کوہ سفید کی مشرقی پہاڑیوں سے لے کر تیراہ کے نصف شمالی، درہ خیبر اور پشاور اور کوہاٹ کے اضلاع سے ملحقہ قبائلی علاقہ میں سکونت پذیر ہیں۔

تیراہ آفریدیوں کا مرکزی مقام ہے اور سطح سمندر سے اس کی بلندی پانچ اور سات ہزار فٹ کے درمیان ہے[۱]۔ قدرتی رعنائیوں سے بھرپور یہ علاقہ حسن، خوبصورتی اور دلکش مناظر میں سوئٹزرلینڈ کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔

آفریدی قبیلہ آٹھ شاخوں میں بٹا ہوا ہے ان میں سے ملک دین خیل، کوکی خیل، زخا خیل، آکا خیل، قمبر خیل، کمر خیل اور سپاہ تیراہ اور خیبر ایجنسی میں رہائش پذیر ہیں جبکہ آدم خیل کوہاٹ اور پشاور کے اضلاع سے ملحقہ قبائلی علاقہ میں رہتے ہیں۔ آدم خیل آفریدیوں کا ایک شاخ تیراہ میں بھی مستقل طور پر مقیم ہے جبکہ باقی آدم خیل درہ کوہاٹ، تورکی، پایہ، جامو، شین ڈنڈ، بوڑہ، کنڈاؤ، کنڈر اور پستاونی میں رہتے ہیں۔ آفریدیوں کے حسب ونسب کے متعلق متضاد نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ خواجہ نعمت اللہ کی نظر میں آفریدی، بنگش، خٹک، وزیر، اورکزئی اور طوری قبائل کرلانڑ کی اولاد ہیں اور ان کا تذکرہ قیس عبدالرشید کے تین بیٹوں سربن، بٹن اور غورغشت سے علیحدہ کیا گیا ہے لیکن ایلفنسٹن کرلانڑ کو قیس کا چوتھا

بیٹااور میکموئن اور ابوالفضل اسے غورغشت کا پوتا سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں کرلانڑی اصلی پٹھان ہیں۔[۲]

آفریدیوں کی اصل نسل کے متعلق یہ روایت چلی آرہی ہے کہ وہ کرلانڑ کے پوتے عثمان (جو بعد میں آفرید کے نام سے مشہور ہوا) کی اولاد ہیں۔ عثمان کیسے آفرید کہلانے لگا اس کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جاڑے کے موسم میں کچھ مہمان ان کے گھر میں آگ کے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ دریں اثنا عثمان وارد ہوا چونکہ رات کی تاریکی میں اپنے پرائے کی پہچان مشکل تھی اسلئے عثمان کے آتے ہی انہوں نے اسے اپنا تعارف کرانے کیلئے کہا ان کے استفسار پر عثمان نے کہا۔ "آفریدہ دخدائے یم"[۳] یعنی میں خدا کا بندہ ہوں اس واقعہ کے بعد عثمان آفرید کے نام سے مشہور ہوا۔

ڈاکٹر بیلیو، جی۔اے گرئیرسن اور بعض دیگر محققین عہد حاضر کے آفریدی ہیراڈوٹس کے آپریتئی (آ) کے آثار سمجھتے ہیں۔ یونانی تحریروں کے ساتھ ساتھ آریاؤں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی "آپریتا" قبیلے کا ذکر کیا گیا ہے جس کے معنی ناقابل شکست کے ہیں اور مورخین یہی قبیلہ آج کے آفریدی سمجھتے ہیں۔ ہیراڈوٹس نے آج سے تقریبا چوبیس سو (۲۴۰۰) برس قبل ایران کے بادشاہ دارا کی ساتویں اقلیم یعنی صوبہ میں ستا گودی، گندھاریو اور دادیکی کے علاوہ اپریتئی قبیلے کا ذکر کیا ہے اور اس نے اپریتئی قبائل کی جو

(آ) آفریدی اپنے آپ کو آفریدی کی بجائے "اوپریدائے" کہتے ہیں اور یہ لہجہ ہیراڈوٹس کے اپاریتئی سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔

خصوصیات بیان کی ہیں وہ آفریدیوں کی عادات واطوار اور خصائل سے ملتی جلتی ہیں۔ ھیراڈوٹس کے مطابق تیر کمان اور خنجر ان لوگوں کے پسندیدہ ہتھیار تھے اور اولف کیرو کے مطابق آفریدی اور وزیر آج بھی خنجر اپنی حفاظت کیلئے رکھتے ہیں[۴]۔ ڈاکٹر بیلیو اور گرئیرسن اس رائے سے متفق ہیں کہ ھیراڈوٹس کے اپریتئی اور عہد حاضر کے آفریدی گہرے رشتوں میں منسلک ہیں تاہم ھیراڈوٹس نے آفریدیوں کے جس علاقے کا ذکر کیا ہے بعض مورخین کے خیال میں وہ علاقہ تیراہ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ خاص طور پر ڈاکٹر احمد حسن دانی تیراہ کا علاقہ آفریدیوں کا آبائی مسکن نہیں سمجھتے[۵]۔

آفریدیوں کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ یہ یونانی النسل ہیں۔ جارج وڈ کاک کے کہنے کے مطابق آفریدی اپنے آپ کو یونانی النسل سمجھتے ہیں اور ہندوکش میں شمال سے لے کر مشرق میں گلگت ہنزہ اور قراقرم کے گردونواح میں آباد لوگ اپنا شجرہ نسب سکندر اعظم سے جوڑتے ہیں۔ اس مورخ کے خیال میں یونانی زیریں سندھ میں سخت مزاحمت کی وجہ سے یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے تاہم انہوں نے پنجاب، گندھارا اور ہندوستان کے مغرب میں درہ خیبر میں بستیاں قائم کیں۔ ڈبلیو، ڈبلیو تھارن کے مطابق باختر کے یونانی حکمرانوں نے دیہی آبادی کے دفاع کیلئے قلعہ نما دیہات تعمیر کئے جو اب بھی پاکستان کے شمال مغربی سرحد پر قبائلی پٹھانوں کے علاقہ میں نظر آتے ہیں یعنی آفریدیوں کے یونانی النسل نظرئیے کی بنیاد ان کے قلعہ نما مکانات، جنگجویانہ صفات، سڈول جسم اور یونانیوں سے گہری مشابہت رکھنے والے اوصاف اور خصوصیات پر رکھی گئی ہے۔ اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے سر اولف کیرو لکھتے ہیں کہ صوبہ سرحد کے پختونوں (پٹھانوں) میں یہ بات اکثر سنی جاتی ہے کہ فلاں قبیلے یا فلاں خاندان کے رگوں میں سکندر یونانی یا اس کے سپاہیوں کا

خون ہے۔ مثال کے طور پر آفریدیوں کے متعلق یہ روایت ہے کہ ان کے رگوں میں یونانی خون دوڑ رہا ہے اور اسی سلسلہ میں ان کے یونانی خدوخال کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کئی نوجوان آفریدی یونانیوں کے دیوتا آپالو کی طرح دکھائی دیتے ہیں صرف آفریدی ہی نہیں بلکہ پٹھانوں کے کئی جنگجو نوجوانوں کی شکل وصورت اور عقابی نگاہیں سکندر اعظم کی یاد دلاتی ہیں کہا جاتا ہے کہ اس علاقے پر یلغار کرتے وقت سکندر اعظم کے فوجیوں نے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد یہاں سکونت اختیار کی اور اسی طرح تیراہ اور خیبر کے لوگوں میں ان کا خون شامل ہوا لیکن اس کے متعلق کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں۔ آفریدیوں کی اصل نسل کے متعلق متضاد نظریات کے باوجود اکثر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ آفریدی، آفرید نامی شخص کی اولاد ہیں لیکن آفرید کے جائے سکونت کے متعلق ان میں اختلاف پایا جاتا ہے

اے۔ ایل۔ ای ہومز کے مطابق آفریدی، آفرید کی اولاد ہیں جو دسویں صدی عیسوی میں مغربی افغانستان میں سکونت پذیر تھا لیکن ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں کے دوران وہ خاندانی رنجشوں اور قبائلی رقابتوں کی وجہ سے اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا اور جیمز کے مطابق آفرید نے شیرہ تلہ (آ) نامی جگہ میں وزیر نامی شخص کے ہاں پناہ لی اور پھر وہاں قیام کیا۔[۶]

آفریدیوں کے حسب ونسب کے متعلق اکثر نظریئے تاریخی حقائق سے زیادہ مفروضات پر مبنی ہیں اسی سلسلے میں جو صحیح معلومات دستیاب ہیں ان کے مطابق آفریدی

(آ) شیرہ تلہ شمالی وزیرستان میں ایک علاقے کا نام ہے۔

آفرید کے چار بیٹوں میرئی، اولا، آکا اور آدم کی اولاد ہیں۔ اولا نے دو شادیاں کی تھیں اس کی زانخی نامی بیوی سے زخاخیل اور میمنہ نامی بیوی سے سپاہ، قمبر خیل، کمر خیل، ملک دین خیل اور کوکی خیل پیدا ہوئے اسی طرح آکا سے آکا خیل اور آدم سے آدم خیل پیدا ہوئے تاہم میرئی کی اولاد قبیلہ میں کوئی خاص مقام حاصل نہ کر سکی اور وہ ملک دین خیل اور آکا خیل میں ضم ہو کر رہ گئی۔

اکثر مورخین نے نہایت دلچسپ پیرائے میں آفریدیوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے مطابق آفریدی گوناگوں خصوصیات کے حامل ہیں ان کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ دشمن کے حملے کی صورت میں انہوں نے اپنے اندرونی اختلافات کو پس پشت ڈال کر ہمیشہ اتحاد کا مظاہرہ کیا اور بیرونی جارحیت کو ناکام بنانے کی غرض سے متحدہ طور پر دشمن کے خلاف صف آرا ہوئے۔ ایلفنسٹن کی نظر میں آفریدی سرحدی قبائل میں اچھے نشانہ باز اور پہاڑی علاقے کے بہترین لڑاکا سپاہی ہیں[۷] سچ تو یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں انہوں نے جرأت اور بہادری کے شاندار مظاہروں پر ایک وکٹوریہ کراس اور کئی دیگر فوجی اعزاز حاصل کئے (آ) لیکن جب انہیں اپنے ترک بھائیوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا تو

(آ) ۵۵ کوکس رائفلز کے میر دوست آفریدی کو جنگ یپرس میں جرأت اور بہادری کا شاندار مظاہرہ کرنے پر ۲۶ اپریل ۱۹۱۵ء میں وکٹوریہ کراس دیا گیا۔ اس کے علاوہ صوبیدار گل اکبر ملک دین خیل آفریدی اور صوبیدار ہاوندہ خان قمبر خیل کو ملٹری کراس دئے گئے۔ اسی سلسلہ میں مزید تفصیلات لفٹیننٹ کرنل ڈبلیو۔ جے کین کی کتاب "دی نارتھ ویسٹ فرنٹیر پراونس اینڈ دی وار" میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

انہوں نے صاف انکار کر دیا ان میں جمعدار میر مست قمبر خیل سر فہرست تھے جو ۵۸ رائفلز کے ۲۷ جوانوں کے ہمراہ فرانس کے ایک محاذ پر فرنگی کی ملازمت کو لات مار کر ترکوں سے جا ملے وہ ترک جرمن مشن کے ہمراہ کابل اور بعد میں تیراہ پہنچے جہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ میر مست کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ۱۹ پنجابی، ۲۰ انفنٹری ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۶ اور ۲۸ پنجابی رجمنٹ، ۵۵ کوکس رائفلز، ۵۸ رائفلز، ۴۰ پٹھان، گائیڈ کیولری اور دیگر فوجی یونٹوں میں خدمات انجام دینے والے سینکڑوں قبائلی جوانوں نے جن میں زیادہ تر ملک دین خیل، قمبر خیل اور آدم خیل آفریدی شامل تھے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا یہی وجہ تھی کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۵ء کو فوج میں قبائلی جوانوں اور خاص طور پر آفریدیوں کی بھرتی پر پابندی عائد کی گئی۔ ترکوں کی حمایت میں فرانس، مصر اور میسوپوٹیمیا میں آفریدیوں کی بغاوت پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل نے جنرل ہڈسن کے نام اپنے ۹ دسمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں لکھا کہ گائیڈ اور ۵۵ کوکس رائفلز کے افسر آفریدی کمپنیوں پر فخر محسوس کرتے تھے لیکن اب وہ کسی قیمت پر بھی آفریدیوں کو دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔[8]

آفریدیوں کی بہادری، مہمان نوازی اور دیگر خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے سر رابرٹ واربرٹن (آ) لکھتے ہیں "اگر کوئی ان کے شکوک و شبہات کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائے اور ان کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آئے تو وہ ہر بات کا جواب خلوص اور

(آ) سر رابرٹ واربرٹن ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۸ء تک خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔

محبت سے دیتے ہیں اور گالی کے علاوہ ہر بات سننے کیلئے تیار رہتے ہیں۔۔۔۔ میں پندرہ برس تک ان لوگوں کے درمیان بغیر اسلحہ کے گھومتا رہا جہاں کہیں میرا خیمہ لگتا اس کی حفاظت یہی لوگ کرتے۔ خیبر کے وہ آفریدی جن کے درمیان خونریز خانہ جنگیاں ہوتی تھیں جب کبھی میرے کیمپ میں یکجا ہوتے تو اس وقت وہ اپنی دشمنیاں عارضی طور پر بھلا دیتے"۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں "جنگ تیراہ کے موقع پر نومبر، دسمبر ۱۸۹۷ء میں جب تیراہ میں باغ کے مقام پر ان (آفریدیوں) کے گھر جل رہے تھے اور ان کے چاروں طرف بربادی اور تباہی کا ڈیرہ تھا تو میں نے آفریدی زعماء کے چیخ و پکار کے جواب میں کہا کہ آج آپ کی مدد کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے افسردہ لہجے میں کہا جو ہونا ہے سو ہو گا لیکن ہم آپ کی خیر و عافیت چاہتے ہیں خدا کرے کہ اس جنگ میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ یہ قبائلی زعماء اور عمر رسیدہ افراد اپنی بربادی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لیکن مصیبت کی اس گھڑی میں بھی ان کو ایک غیر مسلم کی حفاظت کا خیال تھا جس نے انہیں دوست بنانے کے علاوہ ان کیلئے کچھ نہیں کیا تھا"۔[9] اسی طرح ڈگلس ڈانلڈ آدم خیل آفریدیوں کے متعلق اپنے مشاہدات قلمبند کرتے وقت لکھتے ہیں "دغابازی درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کی ایک خصوصیت بیان کی گئی ہے لیکن میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے ان میں دغابازی نہیں پائی بلکہ میری رائے میں وہ قول اور دھن کے پکے ہیں"۔[10]

باب سوم

آدم خیل آفریدی

آدم خیل آفرید کے آدم نامی بیٹے کی اولاد ہیں۔ آدم نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی خاتونئی سے گلی، جواکی اور حسن خیل اور دوسری بیوی آشو سے آشو خیل پیدا ہوئے اس طرح آدم خیل چار بڑی شاخوں یعنی گلی یا گلی خیل، حسن خیل، جواکی اور آشو خیل میں بٹ گئے ان میں سے گلی آفریدی درہ کوہاٹ میں، حسن خیل آفریدی درہ آخور، جونا کوڑ، موسیٰ درہ، تژونی اور سپیر کی میں، جواکی آفریدی پایہ، تور کی، شین ڈند، جامو، بوڑہ اور غریبہ میں اور آشو خیل کنڈاؤ، کنڈر اور اوچہ الگڈہ میں بستے ہیں۔

تاریخی شواہد کی روشنی میں آدم خیل پہلے پہل میدان (تیراہ) میں دریائے باڑہ کے قرب وجوار میں رہائش پذیر تھے لیکن آبادی میں اضافے، قبائلی رقابتوں، معاشی اور اقتصادی وجوہات کی بنا پر وہ کوہاٹ اور پشاور کے اضلاع سے ملحقہ قبائلی علاقہ میں آباد ہو گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ آدم خیل افرادی قوت کے لحاظ سے کمزور تھے اس لئے زخاخیل نے تورہ ولہ میں ان کی جائیداد پر قبضہ کیا اور زخاخیل کے حملوں کا تاب نہ لاتے ہوئے وہ نقل مکانی پر مجبور ہوئے[1] لیکن یہ بات صحیح دکھائی نہیں دیتی کیونکہ آدم خیل کی ایک شاخ اب بھی تیراہ میں موجود ہے اور اگر کسی حادثے یا قبائلی بغض عناد کی وجہ سے وہ اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور تھے تو ایسی صورت میں سارے قبیلے کی نقل مکانی ضروری ہوتی اور تیراہ میں ان کا رہنا محال ہوتا۔ اس کے برعکس اب بھی تیراہ میں آدم خیل کی ایک شاخ موجود ہے اور آشو خیل شاخ کے کالا خیل اور جواکی شاخ کے میر باش خیل، بازید خیل اور سلطان

خیل اب بھی موسم گرما میں تیراہ جاتے ہیں اور موسم سرما میں اپنے دیہاتوں میں واپس آجاتے ہیں البتہ گلی اور حسن خیل موجودہ علاقوں میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہیں۔

آدم خیل کی جنگی قوت سے متعلق وقتاً فوقتاً جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں ان سے بھی اس امر کی تردید ہوتی ہے کہ آدم خیل، زخاخیل یا خیبر کے کسی اور قبیلے کے مقابلے میں عددی لحاظ سے کم اور کمزور تھے۔ ۱۸۸۷ء کی ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق قبیلہ آدم خیل کے مسلح افراد کی تعداد ۴۴۰۰، ملک دین خیل، کوکی خیل اور زخاخیل کی تعداد چار، چار ہزار اور قمبر خیل کی تعداد ۳۵۰۰ تھی۔ ان اعداد و شمار سے یہ اندازہ باسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۸۷ء اور اس کے بعد بھی آدم خیل، آفریدیوں کا سب سے بڑا قبیلہ تھا[2]۔ متذکرہ بالا حقائق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آدم خیل نے وادی وران کے مشرقی اطراف، باڑہ اور میدان میں اپنی املاک زخاخیل کی جارحیت اور ان کی بالادستی کی وجہ سے نہیں چھوڑی بلکہ وہ معاشی اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے نقل مکانی پر مجبور ہوئے انہیں کھیتی باڑی کیلئے زیادہ قابل کاشت زمین درکار تھی اور انہیں موجودہ علاقوں میں ایسی سہولت میسر آئی۔

درہ آدم خیل

درہ کوہاٹ کی وجہ سے آدم خیل آفریدیوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ درہ زمانہ قدیم سے کوہاٹ اور پشاور کے درمیان آمدورفت کا بڑا ذریعہ رہا ہے اسلئے انگریزوں نے سرحد آتے ہی اس درے کے راستے آمدورفت جاری رکھنے کی غرض سے ۱۸۴۹ء میں گلی اور حسن خیل قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے تحت انہیں سڑک کی حفاظت کیلئے سالانہ ۵۷۰۰ روپے کی مواجب دئے جانے لگے۔

یہ درہ پشاور سے تقریباً اٹھارہ (۱۸) میل اور کوہاٹ سے تقریباً سات (۷) میل کے فاصلے پر واقع ہے اس کی لمبائی تقریباً پندرہ (۱۵) میل اور پہاڑوں کی بلندی تین سے پانچ ہزار فٹ ہے۔ بعض مقامات پر یہ درہ تنگ اور کہیں کشادہ ہے اور یہاں کھیتی باڑی کیلئے زمین بھی دستیاب ہے۔ اس درہ میں گلی شاخ کے زرغن خیل، شیرا کی، بوستی خیل، سنی خیل، شپلکی وال، کوہی وال، ان سے اوپر تورسپری اور حسن خیل شاخ کے آخوروال اور گڈیا خیل آباد ہیں۔

درہ آدم خیل میں سب سے پہلے آبادی زوڑ کلی (پرانا گاؤں) (آ) میں ہوئی تھی۔ شروع میں صرف زرغن خیل اور شیرا کی زوڑ کلی میں قیام پذیر تھے[۳۱] لیکن آبادی میں اضافے کی ساتھ ہی انہوں نے سڑک کے آس پاس بھی مکانات تعمیر کرلئے اور اب گلی اور حسن خیل پورے درے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک سرکاری اندازے کے مطابق ۱۹۰۱ء میں درہ آدم خیل کی آبادی دس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ان کے مسلح جوانوں کا اندازہ ۲۲۹۰ لگایا گیا تھا۔

گلی کا شجرہ نسب

زرغن خیل، شیرا کی، بوستی خیل، اور تورسپری گلی کے دولڑکوں سید علی اور یاغی کی اولاد ہیں۔ سید علی کے ہاں حسن علی، یار علی اور شیر علی اور یاغی کے ہاں ابوبکر اور فیروز نامی

(آ) زوڑ کلی میں زرغون خیل اور شیرا کی اکھٹے رہتے تھے لیکن بعد میں وہ سڑک کے کنارے آباد ہوگئے ڈانلڈ کے کہنے کے مطابق ۱۹۰۱ء میں یہاں کاریگروں کے چند خاندان بستے تھے۔

لڑکے پیدا ہوئے ۔ یار علی نے دو شادیاں کی تھیں ۔ اس کی پہلی بیوی زرغونہ سے زرغون خیل اور دوسری سے شپلکی وال اور یاران خیل پیدا ہوئے اسی طرح حسن علی سے سنی خیل، شیر علی سے شیرا کی اور بوستی خیل اور ابو بکر اور فیروز سے تور سپری پیدا ہوئے ۔

زرغن خیل

زرغن خیل (جن میں محمد خیل، ملاخیل، قاسم خیل اور میری خیل شامل ہیں) یار علی کی اولاد ہیں ۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخری عشروں میں تلم خیل کے ملک غلام اور ملک خانئی (آ) زرغون خیل کا شمار درہ آدم خیل کے بااثر افراد میں کیا جاتا تھا اسی طرح بیسویں صدی کے اوائل میں ملک فیروز خان، ملک شہاب الدین، ملک نوازی اور ملک اولس خان زرغن خیل کی جانی پہچانی شخصیات تھیں ۔

زرغن خیل کو شہیدہ تالاب سے پلوسین (پلوسے گوٹ) تک سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس مقصد کیلئے انہیں ۱۹۱۹ء میں ۳۹۰۰ روپے بطور مواجب دیئے جاتے تھے جو وہ آپس میں پانچ برابر حصوں میں تقسیم کرتے تھے مواجب کے علاوہ ملک فیروز

(آ) ڈی ڈانلڈ کے مطابق زرغون خیل کے ملک خانئی (خان بہادر خان) نہ صرف اپنے قبیلے بلکہ تقریباً تمام آدم خیل میں زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے ۔ انہیں ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کو کوہاٹ میں ایک دربار کے موقع پر خلعت عطا کیا گیا ۔ ۱۹۰۰ء میں وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ۔

خان (آ) ملک ستار، ملک نوازی اور ملک اولس کو ساٹھ، ساٹھ روپے بطور ڈاک الاؤنس بھی دئیے جاتے تھے ۔ ۱۸۹۹ء میں جب زرغن خیل کے مواجب میں ایک ہزار روپے کا اضافہ کیا گیا تو اس میں سے ۱۲۰ روپے ملک فیروز، ملک نوازی اور ملک اولس کو بطور مشرانہ دیئے گئے اور باقی رقم زرغن خیل کے پانچ شاخوں میں برابر تقسیم کی گئی۔[۴] گلی قبائل میں وقتاً فوقتاً لڑائیاں بھی ہوتی رہیں ۔ ۱۸۶۰ء میں زرغن خیل اور شیرا کی کے مابین نمک کی تجارت پر لڑائی شروع ہو گئی جس میں فریقین کا ایک ایک آدمی ہلاک اور کئی زخمی ہوئے ۔ اس لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ تلم خیل نے شیرا کی کے بدرگہ کی معیت میں آنے والے نمک کے کوچی سوداگروں کے ایک قافلے پر حملہ کیا تھا۔[۵] زرغن خیل کے مابین ۲ جون ۱۹۲۲ء کو لڑائی شروع ہوئی جو وقفے وقفے سے چار سال جاری رہی ۔ یہ لڑائی غلام رسول (ب) اور خوشحال کے درمیان شروع ہو گئی جس

(آ) ۱۹-۱۹۱۸ء کے ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ملک فیروز خان ۲۳ جنوری ۱۹۱۹ء میں وفات پا گئے انہیں درہ آدم خیل میں سب سے زیادہ لنگی لینے کا اعزاز حاصل تھا اور قومی جرگوں میں ان کے فیصلوں کا احترام کیا جاتا تھا ۔ وہ اپنے فہم و فراست سے نہ صرف شیرا کی، بوستی خیل اور تور سپر بلکہ کئی موقعوں پر حسن خیل کے تنازعات بھی جرگوں کے ذریعے ختم کرانے میں کامیاب ہوئے تھے ۔

(ب) میر غلام کلی کے محمد اشرف، محمد شریف، موسیٰ خان اور نور سید غلام رسول اور حاجی خان افضل، میر زمان اور شماس گل وغیرہ سید رسول کے فرزند ہیں ۔

میں اولس خان، ظہرہ دین، سمند خان اور عبدالخالق، سید رسول اور اس کے بھائی غلام رسول کا ساتھ دے رہے تھے۔ جبکہ درے خان، جمعدار سرمست اور حیات خان، خوشحال کے حلیف تھے
اس لڑائی کو بند کرانے میں حکومت کی کوششوں کی ناکامی کے بعد حسن خیل کے ایک جرگہ نے متحارب فریقین کے مابین مصالحت کی کوشش کی لیکن اسے بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا آخر جواکی قبیلے کے ایک جرگے نے مداخلت کی اور ۲۷ جولائی ۱۹۲۲ء کو حسب ذیل فیصلہ سنایا۔

(ا) لڑائی میں ہلاک شدہ چھ افراد کے خاندان کو پانچ سو روپے فی کس کے حساب سے مجموعی طور پر تین ہزار روپے خون بہا دیا جائیگا زخمیوں میں سے درانی ولد سیدن شاہ کو ۲۶۰ روپے، غلام شاہ کی بیوی کو ۱۰۰ روپے، سداگل کو ۶۰ روپے، خوشحال کی بیوی کو ۸۰ روپے، لعل شیر کو ۶۰ روپے، عبداللہ نور کی بیوی کو ۵۰ روپے اور سید رسول کو ۵۰ روپے بطور ہرجانہ دئے جائیں گے۔

(ب) خوشحال کے گھر پر سید رسول کے حملے کے دوران توڑی ہوئی انگریزی بندوق کا سات سو روپے معاوضہ دیا جائیگا

(ج) خون بہا ہرجانہ اور بندوق کے معاوضے کی رقم ۴۳۶۰ روپے بنی جس کی ادائیگی کیلئے جرگہ نے ایک مہینہ کی مہلت دی۔ آخور کے ملک آزاد نے اولس خان کی طرف سے اس رقم کی ضمانت دی اور اس کی ادائیگی کے بعد جرگہ نے غلام رسول اور سید رسول کو اپنا پرانا گاؤں از سر نو تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔

دشمنی اور عناد کی چنگاری جو بظاہر جرگہ کے فیصلے سے دب گئی تھی کچھ عرصہ بعد شعلوں کی صورت میں بھڑک اٹھی اور اس نے زرغن خیل کو نئے سرے سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ملک درے خان نے ۲۸ نومبر ۱۹۲۴ء کو چیف کمشنر کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا اہتمام کیا تھا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے مخالفین گھات میں بیٹھ گئے۔ چیف کمشنر کو الوداع کہنے کے بعد جب درے خان سڑک کے راستے واپس گھر کی جانب روانہ ہوا تو طالب خان اور شیر از زرغن خیل کے برج سے اس پر فائرنگ کی گئی۔ مخالفین کی ایک گولی اس کے سینے سے آرپار نکل گئی اور دو گولیاں بدن میں پیوست ہو گئیں اس فائرنگ کے جرم میں حکومت نے اولس خان اور اس کے ساتھیوں پر دس ہزار روپے جرمانہ عائد کیا اور ۱۶ دسمبر ۱۹۲۴ء کو وہ برج مسمار کر دیا گیا جہاں سے درے خان پر گولیاں چلائی گئی تھیں۔[۶]

شیراکی

شیراکی شیر علی کے بیٹے آستو کی اولاد ہیں۔ باش خیل اور مبارک خیل شیراکی کی دو مشہور شاخیں ہیں اگرچہ آج کل ایمل خیل کا شمار بھی شیراکی میں کیا جاتا ہے لیکن ایمل خیل دراصل بوستی خیل کی ایک شاخ ہے جس نے عرصہ دراز سے شیراکی کے ہاں پناہ لی ہوئی[۷] ہے۔ شیراکی کے بعض خاندان خڑہ گڑھئی اور کوہاٹ کے کچھ دیگر بانڈہ جات میں مقیم ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ملک ناظم، ملک مدگل اور سیدن خان شیراکی کی مشہور شخصیات تھیں۔

مئی ۱۹۲۷ء میں ایمل خیل کے محمد گل اور نور خان (جس کی حمایت مبارک خیل کر رہے تھے) کے درمیان لڑائی شروع ہوئی جو ایمل خیل اور مبارک خیل کے درمیان دشمنی اور

عناد کی وجہ بن گئی۔ ۲۸ جون کو ایمل خیل اور مبارک خیل کے درمیان فائرنگ شروع ہوئی اورسڑک کے آرپار گولیاں چلانے پر ایمل خیل کو ایک ہزار روپے اور مبارک خیل کو پانچ سو روپے جرمانہ کیا گیا۔[8]

بوستی خیل

بوستی خیل شیر علی کے بیٹے بوستی کی اولاد ہیں اور خونی رشتے کے حوالے سے شیرا کی کے چچازاد بھائی ہیں۔ تاش خیل، تورا خیل، مونڈا خیل، یونس خیل، ایمل خیل، لنڈی خیل، ظفر خیل، مصری خیل اور قدر خیل بوستی خیل کی اہم شاخیں ہیں ان میں سے یونس خیل آج کل شاہ پور اور ضلع کوہاٹ کے بعض دیگر مقامات میں آباد ہیں۔

بوستی خیل اور شیرا کی کو کوتل سے سنڈہ بستہ تالاب تک سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس مقصد کیلئے انہیں ۱۸۵۳ء میں بالترتیب ۴۷۵ روپے، ۱۸۸۳ء میں ۷۱۵ روپے، ۱۹۰۱ء میں ۱۲۱۵ روپے اور ۱۹۱۹ء میں ۲۴۳۰ روپے کے مواجب دئے جاتے تھے۔ شیرا کی اپنے حصے کے مواجب کو دو برابر حصوں میں اور بوستی خیل آٹھ برابر حصوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیرا کی کے مواجب کا ایک حصہ باش خیل اور دوسرا حصہ مبارک خیل کو دیا جاتا تھا مبارک خیل اپنے مواجب کا تیسرا حصہ ایمل خیل اور درمہ خیل کو دیا کرتے تھے۔

تورسپری

تورسپری یاغی کے دو بیٹوں ابوبکر اور فیروز کی اولاد ہیں اور فیروز خیل، نیکزن خیل اور کوہی خیل اس کی تین بڑی شاخیں ہیں۔ تورسپر کی وادی تقریباً تین میل لمبی اور

ایک میل چوڑی ہے اور اسے سنڈہ بستہ تالاب کے قریب ایک سڑک جاتی ہے۔ یہاں کی زمین زرخیز اور گورنمنٹ ہائی سکول تورچپر کے مشرقی اطراف میں پانی کی فراوانی ہے جبکہ سکول کے مغربی علاقے میں پانی کی قلت ہے۔ تورسپری قبائل کو سنڈہ بستہ تالاب سے شہیدہ تالاب تک سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور اس مقصد کیلئے انہیں ۱۹۱۹ء میں ۲۴۰۰ روپے سالانہ بطور مواجب ادا کئے جاتے تھے اس میں سے ایک چوتھائی حصہ کوہی وال اور باقی رقم فیروز خیل اور نیکزن خیل میں برابر تقسیم کی جاتی تھی۔ گلی آفریدیوں کے اکثر شاخوں کی طرح تورسپری قبائل کی مختلف شاخیں بھی قبائلی بغض وعناد کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ یہاں کے بعض افراد مسلسل لڑائیوں سے تنگ آکر رازگیر بانڈہ، شاہ پور اور ضلع کوہاٹ کے گردونواح میں آباد ہوگئے ہیں۔

سنی خیل

سنی خیل حسن علی کی اولاد ہیں جو شہیدہ تالاب کے شمال مغرب میں کوئی ڈھائی میل لمبی وادی میں بستے ہیں بیسویں صدی کے آوائل میں یہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی آبپاشی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔

حسن خیل

حسن خیل آفریدی آخوروال (تاتار خیل) اور جونا کڑی حسن خیل کے نام سے مشہور ہیں ان میں آخوروال شاخ کے بولا کی خیل، گڈیا خیل اور پیرول خیل، ایمل چبوترہ (سپینہ تھانڑہ) کے قرب وجوار میں تقریباً پانچ میل کے علاقے میں آباد ہیں۔ جبکہ جونا کوڑی

حسن خیل جو تاتکی اور بار کی شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں، کوہی، موسیٰ درہ، تژونی اور جونا کوڑ میں رہتے ہیں۔ تژونی اور کوہی میں میاں خیل اور زاخو خیل اور موسیٰ درہ میں بار کی اور تاتکی شاخ کے حسن خیل آباد ہیں۔ ۱۹۰۱ء کے ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق حسن خیل کے مسلح نوجوانوں کی تعداد بارہ سو (۱۲۰۰) اور پندرہ سو (۱۵۰۰) کے درمیان تھی۔

آخوروال

آخوروال درہ آدم خیل میں رہائش پذیر ہیں ان میں گڈیا خیل (بار کی) بولا کی خیل (تاتکی) اور پیرول خیل (نور ملک) شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخوروال کو پلوسین سے ایمل چبوترہ تک سڑک کی حفاظت کیلئے ۱۸۵۳ء میں ۲۵۸۰ روپے، ۱۹۰۱ء میں ۲۹۰۰ روپے اور ۱۹۱۹ء میں ۵۸۰۰ روپے سالانہ بطور مواجب دئیے جاتے تھے۔ اس میں سے دو حصے گڈیا خیل، دو حصے بولا کی خیل، ایک حصہ پیرول خیل اور ۴۰۰ روپے جونا کوڑی حسن خیل کو ملتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں تمام حسن خیل کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کے زیر انتظام تھے لیکن ۱۸۹۶ء میں جونا کوڑی حسن خیل کی نگرانی پشاور کے ڈپٹی کمشنر کے سپرد کی گئی۔

۱۸۶۳ء میں بولا کی خیل اور گڈیا خیل کے درمیان مواجب اور زمین کے تنازعہ پر لڑائی شروع ہو گئی جس نے بعد میں قومی لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ گلی نے بولا کی خیل اور حسن خیل نے گڈیا خیل کی حمایت شروع کی۔ یہ لڑائی جس میں بارہ افراد ہلاک اور ۶۲ زخمی ہوئے، ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو ختم ہوئی۔ ہلاک شدگان میں چھ حسن خیل، تین گڈیا خیل، تین گلی اور زخمیوں میں ستائیس حسن خیل، چھ گڈیا خیل، تیرہ گلی اور سولہ بولا کی خیل شامل تھے۔

ہلاک شدگان کو ۳۶۰ افغانی (کابلی روپے) فی کس بطور خون بہا، شدید زخمی افراد کو ۱۸۰ افغانی فی
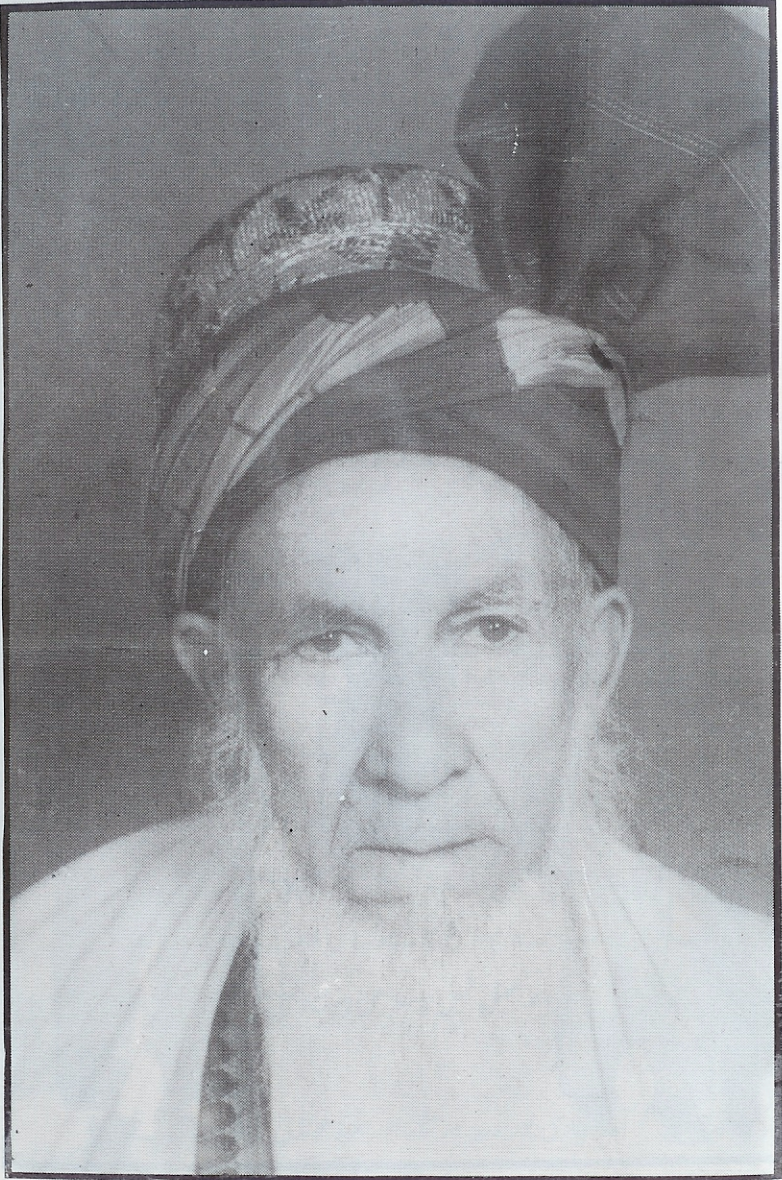
اہل فیروز کے موجودہ سربراہ۔ ملک حاجی حکیم خان

کس اور معمولی زخمی افراد کو ۵۰ افغانی فی کس بطور ہرجانہ ادا کئے گئے۔[9] ۱۸۶۷ء میں گڈیا خیل اور بولا کی خیل کو قلم سدہ میں زمینں دی گیئں۔

جوا کی

جوا کی آدم کی پہلی بیوی خاتونئی کی اولاد ہیں اور یہ ہیبت خیل اور قیمت خیل نامی دو بڑے شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ماول خیل، غلام خیل، شاہی خیل اور سلطان خیل، ہیبت خیل شاخ کے ساتھ اور قاسم خیل، اسماعیل خیل اور ابراہیم خیل، قیمت خیل شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۷۷ء میں ان کی افرادی قوت کا اندازہ بارہ سو (۱۲۰۰) اور ۱۹۰۱ء میں ۲۵۰۰ لگایا گیا تھا۔

جوا کی کوہاٹ کے مشرقی جانب پایہ، تور کی، سور کی، جامو، شین ڈنڈ، بوڑہ، پستاونی اور غریبہ میں آباد ہیں۔ درہ تور تنگ سے جوا کی پتاؤ کی لمبائی ۱۸ میل اور شین ڈنڈ سے جامو تک چوڑائی تقریباً ۶ میل ہے۔ شین ڈنڈ سے جامو تک علاقہ ہموار اور میدانی ہے جبکہ باقی ماندہ علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں پیر یانو کمر بہت مشہور ہے جو مشرق میں پایہ اور غریبہ کو جوا کی کے باقی دیہات سے جدا کرتا ہے۔ اس وادی کے مغربی حصہ میں قیمت خیل شاخ کے قاسم خیل اور اسماعیل خیل، وسط میں ہیبت خیل اور مشرقی اطراف میں مغل خیل یا ماول خیل رہتے ہیں۔

علاقہ جوا کی کو تھانہ شادی پور، درہ تور تنگ اور سرہ غونڈئی سے راستے جاتے ہیں ایک اور سڑک پتاؤ اور سویری جوا کی سے نرئی خولہ کے راستے پستاونی، بوڑہ، سر غاشی درہ، کنڈاؤ، آخنا خیل اور ادیزئی تک جاتی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں جب درہ کوہاٹ کی سڑک آمدورفت کیلئے

درہ آدم خیل (آخور) میں انگریزی استبداد کی آخری نشانی فوکس پوسٹ اب نظروں سے معدوم ہو چکی ہے

بند کی گئی تو انگریزوں نے اسی راستے پشاور اور کوہاٹ کے درمیان نمک کی تجارت جاری رکھنے کی ایک تجویز پر غور شروع کیا تھا۔

بوڑہ

بوڑہ پشاور سے تقریباً ۲۲ میل اور کوہاٹ سے ۲۳ میل دور واقع ہے یہ علاقہ دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ بوڑہ کے آفریدی پشاور سے خیر آباد تک لکڑی کے کوئلے کی تجارت کیا کرتے تھے چونکہ بوڑہ کا علاقہ حسن خیل سے ملحقہ ہے اس لئے بوڑہ کے قبائل جواکی اور حسن خیل کے مابین لڑائیوں میں ہمیشہ غیر جانبدار رہے۔ بوڑہ فوجی نقطہ نظر سے اہم مقام تھا اسلئے انگریزوں نے ۱۸۵۳ء اور ۷۸-۱۸۷۷ء میں بوڑہ پر حملے کئے اور پھر جواکی قبائل کی طاقت کو منتشر کرنے کی غرض سے کچھ جواکی ڈپٹی کمشنر کوہاٹ، کچھ ڈپٹی کمشنر پشاور اور کچھ خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

سکھوں کے دور حکومت میں بوڑہ اور جوناکوڑ جہاد کے دو بڑے مراکز تھے اور آفریدی مجاہدین پشاور سے لے کر اٹک تک سکھوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ سکھ دور حکومت میں پشاور کے گورنر جنرل ایوی ٹبائل (ابوطبیلہ) نے بوڑہ اور جونا کوڑ کے آفریدیوں کی سرکوبی کیلئے کئی مہم بھیجے لیکن ہر موقع پر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آفریدیوں کے حملوں سے تنگ آکر جنرل ایوی ٹبائل نے پشاور کے اردگرد حفاظتی دیوار تعمیر کی اور چمکنی کے ایک سربرآوردہ شخص کو اسی شرط پر جاگیر عطا کی کہ وہ ہر سال بیس (۲۰) آفریدیوں کے سر پیش کرے گا۔ جواکی قبیلہ کے بعض لوگ بابری بانڈہ، غلام بانڈہ اور راز گیر بانڈہ میں مقیم ہیں اور تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے خوشحال ہیں۔ خاص طور پر بابری بانڈہ کے باسی فوج

اور سول ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں بابری بانڈہ کے لفٹیننٹ جنرل محمد یوسف نے سفارتی محاذ پر اور ان کے بڑے بھائی کرنل ڈاکٹر منور خان آفریدی مرحوم نے پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے صوبہ سرحد کی جو علمی خدمت کی ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

آشو خیل

آشو خیل، آدم کی دوسری بیوی آشو کی اولاد ہیں۔ علی خیل اور محمدی، آشو خیل کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ آشو خیل کنڈاؤ، کنڈر اور اوچہ الگڈہ میں بستے ہیں۔ کنڈاؤ میں محمدی شاخ کے روخان خیل، مہابتی خیل اور حسن بی خیل اور کنڈر میں علی خیل شاخ کے پریدی آباد ہیں۔ اس کے علاوہ خیرہ دین شاخ کے پنجی اوچہ الگڈہ اور بوڑہ کے درمیان رہتے ہیں۔ ۱۸۸۷ء میں آشو خیل کے مسلح افراد کا اندازہ سات (۷۰۰) سو لگایا گیا تھا۔

۱۸۹۶ء میں گلی اور کالا خیل کے درمیان گڑھی زید گل کے کاکا خیل میاں کے قتل پر لڑائی شروع ہوئی۔ گلی آفریدیوں نے کاکا خیل میاں کے قتل پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کالا خیل پر حملہ کیا اور اوچہ الگڈہ میں ان کے گھروں کو جلا دیا لیکن اس حملے کے باوجود بھی زید گل میاں کے خاندان کے ساتھ کالا خیل کے سلوک میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ۱۱ اکتوبر

۱۹۱۰ء میں گلی اور حسن خیل قبائل کا ایک جرگہ تور تقیر کے مقام پر منعقد ہوا(آ) جس میں میاں خیل کے ساتھ کالا خیل کی سلوک کی سخت مذمت کی گئی اور انہیں تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ گوحی زیدگل کے میاں خیل کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کرنے پر مصر رہے تو پھر ان کے خلاف لشکر کشی کی جائیگی۔ اسلئے ۱۸-۱۹۱۷ء میں زرغون خیل نے کالا خیل پر دوبارہ حملہ کیا یہ لڑائی ایک سال تک جاری رہی[11]

۱۸۹۷ء میں کنڈاؤ اور کنڈر کے آشو خیل ڈپٹی کمشنر پشاور کی تحویل میں دئے گئے اور ۱۹۲۳ء میں کالا خیل خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر انتظام لائے گئے[12]۔

(آ) اس جرگہ میں زرغن خیل کے ملک فیروز خان اور ملک شہاب الدین، بوستی خیل کے ملک رحمت، شیراکی کے ملک پردل اور شیر دل، گڈیا خیل کے ملک اجمیر، مشال، امبار خان اور جلات اور بولا کی خیل کے ملک اشرف، معراج اور جوار نے شرکت کی۔

باب چہارم

انگریز کی جارحانہ حکمت عملی

آدم خیل کے ساتھ تعلقات

جری اور جفاکش آفریدیوں کی پوری تاریخ قربانی، ایثار اور بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے اور انگریزوں اور آدم خیل کے درمیان لڑائیاں بھی اسی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں۔ اگر ایک طرف انگریز اپنے توسیع پسندانہ عزائم اور سامراجی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے اور پٹھانوں کو زیر تسلط لانے کیلئے کوشاں تھے تو دوسری طرف آدم خیل بھی اپنی آزادی کے تحفظ کیلئے تن من دھن کی بازی لگانے پر تلے ہوئے تھے۔

درہ کوہاٹ کی سڑک سیاسی اور فوجی اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی تھی اسی راستے پشاور اور کوہاٹ کا درمیانی فاصلہ ۳۶ میل تھا جبکہ راولپنڈی کے راستے یہ فاصلہ ۱۷۰ میل بنتا تھا[۱]۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے سرحد آتے ہی ۱۸۴۹ء میں آخوروال، زرغون خیل، شیراکی، بوستی خیل اور تورسپری آفریدی قبائل کے ساتھ سڑک پر آمدورفت جاری رکھنے کے سلسلہ میں ایک معاہدہ کیا (آ) جس کے تحت انہوں نے ۵۷۰۰ روپے مواجب کے بدلے سڑک کی حفاظت کی

(آ) آدم خیل آفریدی درہ کوہاٹ کے راستے سفر کرنے والے افراد اور حکومت وقت سے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے اور درہ آدم خیل میں زیندار تڑہ کے قریب چونے کے چٹانوں کے غار ٹیکس وصولی کی منظر کی یاد دلاتے ہیں۔

ذمہ داری قبول کی۔ انگریزوں نے اس خیال سے کہ آدم خیل مواجب کے بدلے پختہ سڑک تعمیر کرنے کی اجازت دیں گے، ۱۸۵۰ء میں کوہاٹ کی طرف سے کوتل کے پہاڑ میں سڑک کی تعمیر کا کام شروع کیا لیکن درہ کے قبائل نے سڑک کی تعمیر کو اپنے مفادات کے منافی سمجھتے ہوئے ۲ فروری ۱۸۵۰ء کو دریا خان کی سرکردگی میں اس فوج پر حملہ کیا جو سڑک بنانے پر مامور تھی اس حملے میں دشمن کے بارہ آدمی ہلاک اور چھ زخمی ہوئے۔ جے۔ جی ایلیٹ کے مطابق یہ حملہ بنیادی طور پر سڑک کی تعمیر کے خلاف ایک احتجاج تھا کیونکہ سڑک کی تعمیر سے درہ کے آفریدیوں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا[۲]۔ انگریز مٹھی بھر آفریدیوں کی جراتمندانہ کاروائی پر اتنے برافروختہ ہوئے کہ طاقت کے بل بوتے پر آفریدیوں کو زیر کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کیلئے فوج کے کمانڈر انچیف سر چارلس نیپئر خود پشاور آئے اور ۷ فروری ۱۸۵۰ء کو ۳۲۰۰ جوانوں اور افسروں پر مشتمل فوج کو سر کالن کیمبل کی سرکردگی میں درہ آدم خیل پر حملے کا حکم دیا گیا۔ اس حملے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ کوہاٹ میں متعین فوجوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے اور آفریدیوں کو ان کی سرکشی کی سزا دی جائے[۳]۔

درہ پر حملہ کرتے وقت انگریزوں نے نہایت رازداری اور احتیاط سے کام لیا اور سامان حرب و ضرب سے آراستہ فرنگی فوج نے ۱۰ فروری ۱۸۵۰ء کو درہ آخور پر اچانک حملہ کرکے آخوروال کا محاصرہ کر لیا۔ چونکہ آخوروال اس غیر متوقع حملے کیلئے تیار نہیں تھے لہذا انہوں نے صلح کی بات چیت شروع کی لیکن انگریزوں نے انہیں یکطرفہ طور پر ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ انگریزوں کی اس شرط کو ان کی غیرت و حمیت برداشت نہ کر سکی اور آخوروال کی مختصر سی محصور جمعیت نے عزت کی موت کو ترجیح دیتے ہوئے فرسٹ پنجاب انفنٹری پر بھرپور حملہ کیا لیکن جنگی سامان کی کمی کی وجہ سے وہ لوگ آخر میں پسپائی پر مجبور ہوگئے۔

حملہ آور افواج نے ان کی املاک کو نقصان پہنچایا اور دوسرے مرحلے میں زرغون خیل سے ٹکر لی۔ زرغون خیل بھی دشمن کے مقابلہ میں خالی ہاتھ تھے لیکن پھر بھی دشمن کا مقابلہ پامردی کے ساتھ کیا۔ پیگٹ اینڈ میسن اس لڑائی کے متعلق لکھتے ہیں "دشمن (آفریدیوں) نے پہاڑوں کی چوٹیوں سے ان پر (انگریزوں) گولیاں برسائیں اور ان میں (انگریزی فوج) کئی افراد کو ہلاک اور زخمی کیا۔[۴] چونکہ زرغون خیل تعداد میں بہت کم تھے اور دشمن کے مقابلے میں ان کا اسلحہ بھی ناقص اور دقیانوسی تھا اسلئے انگریزی فوج کو کامیابی ہوئی اس نے زرغون خیل کے مکانات کو منہدم کرنے کے بعد پیش قدمی جاری رکھی۔ کوہی کے مقام پر درہ کے آفریدیوں نے حملہ آور فوج کی سخت مزاحمت کی اور بوستی خیل نے اس کا تعاقب کیا اس لڑائی میں دشمن کے ۹۳ فوجی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان میں لفٹیننٹ سیٹ ویل بھی شامل تھے۔[۵] اس فوجی مہم سے کوئی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے اور درہ کوہاٹ کی سڑک آمدورفت کیلئے بند رکھی گئی جو بعد میں نومبر ۱۸۵۰ء میں ٹریفک کیلئے کھولی گئی۔

۲۹ فروری ۱۸۵۰ء میں آدم خیل، بیزوٹی، عثمان خیل (اور کزئی) کے قبائل پر مشتمل ایک لشکر نے کوتل کی چوکی پر حملہ کیا اور ملتانی فوج کے اس دستے کو مار بھگایا جو اس چوکی میں متعین پولیس کی مدد کیلئے بھیجا گیا تھا اس حملہ میں بھی غازیوں کے ہاتھوں دشمن کے گیارہ (۱۱) سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔[۶] ۲ مارچ ۱۸۵۰ء کو آدم خیل آفریدیوں نے کوتل (غاخی) کی چوکی پر دوسرا حملہ کیا اور اسے تہہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ ۲۰ دن بعد یعنی ۲۲ مارچ کو گلی آفریدیوں کے ایک مختصر لشکر نے توغ نامی گاؤں کے قریب ایک فوجی دستے پر حملہ کر کے ایک انگریز افسر کو ہلاک کیا۔ انگریز اس حملے پر اتنے برآفروختہ ہوئے کہ انہوں نے ۲۴ اپریل ۱۸۵۰ء کو درہ پر حملہ کیا لیکن مالی اور جانی نقصانات کے باوجود بھی آدم خیل انگریز

کی قوت اور لاؤ لشکر سے مرعوب نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی جدوجہد کو بدستور جاری رکھا۔

انگریز جب طاقت کے بل بوتے پر آدم خیل کو زیر نہ کر سکے تو پھر ان کے خلاف ناکہ بندی کا حربہ استعمال کیا اور پشاور اور کوہاٹ کے اضلاع میں درہ آدم خیل کے مردوں اور عورتوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ ناکہ بندی کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر ایک علاقے کے جغرافیائی محل وقوع پر ہوتا ہے۔ چونکہ درہ آدم خیل چاروں اطراف سے علاقہ سرکار میں گھرا ہوا تھا اسلئے ان کے خلاف ناکہ بندی کا حربہ نہایت کامیاب رہا۔ اس ناکہ بندی کی وجہ سے نقل وحمل کے راستے مسدود ہوگئے اور قبائل کو غذائی اشیاء کی فراہمی میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم انہوں نے تمام تکالیف کا مقابلہ عزم وہمت کے ساتھ کیا۔ انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے حربے کے تحت گلی اور جواکی قبائل کے درمیان عداوت اور نفاق پیدا کرنے کی غرض سے جواکی قبائل سے ان کے علاقہ میں سڑک تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی مگر جواکی قبائل نے فہم وفراست سے کام لیتے ہوئے انگریزوں کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ انگریز جب جواکی اور گلی آفریدیوں کو آپس میں دست وگریبان کروانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے ایک اور فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش کی جس کا مقصد پہلے آفریدی اور اورکزئی اور بعد میں بنگش اور آفریدی قبائل کو لڑوانا تھا اس مقصد کے تحت حکومت نے آٹھ ہزار روپے (آ) مواجب کے بدلے اور کزئی

(آ) مذکورہ رقم میں سے دو ہزار روپے رحمت خان کو اور باقی چھ ہزار روپے اورکزئی قبائل کو کوتل (غاخی) میں سو چوکیداروں کی تعیناتی کیلئے دئے گئے۔ اسی طریقہ سے ۱۸۵۰ء میں درہ کی سڑک کی حفاظت کیلئے سالانہ مواجب ۱۲۷۰۰ روپے ہوگئے اس میں سے ۵۷۰۰ روپے درہ کے قبائل کو جبکہ باقی رقم اور کزئی قبائل کو دی جاتی تھی۔

قبیلہ کے سردار رحمت خان کو کوہاٹ سے کوتل تک کی سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی۔[7]

نومبر ۱۸۵۰ء سے اکتوبر ۱۸۵۳ء تک درہ کی سڑک پر آمدورفت جاری رہی لیکن انگریزوں کے منصوبے کے عین مطابق جلد ہی قبائلی عناد لڑائی کی صورت میں نمودار ہوا۔ آدم خیل آفریدی سردار رحمت خان اورکزئی کی بالادستی قبول کرنے پر تیار نہیں تھے اسلئے انہوں نے اکتوبر ۱۸۵۳ء کو کوتل میں مقیم اورکزئی چوکیداروں پر حملہ کیا اور سڑک آمدورفت کیلئے بند کردی۔ انگریز تو چاہتے یہی تھے کہ اورکزئی اور آفریدی آپس میں گتھم گتھا ہو جائیں۔ اس حملے سے ان کا یہ مقصد پورا ہوگیا اس جھڑپ کے بعد سڑک پر آمدورفت معطل ہوگئی۔ آمدورفت بحال کرنے کی غرض سے چیف کمشنر نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر ایچ۔ آر۔ جیمز کو گلی اور حسن خیل آفریدیوں پر مشتمل ایک جرگہ بلانے کی ہدایت کی۔ ۵ نومبر کو ان کے ایک نمائندہ جرگے نے چیف کمشنر سے ملاقات کی جس نے مندرجہ ذیل شرائط جرگے کے سامنے رکھیں۔

(ا) کوتل (غاخی) سے کوہاٹ تک سڑک کی حفاظت کی ذمہ داری ۷۷۰۰ روپے مواجب کے عوض قبیلہ بنگش کو دی جائے۔

(ب) درہ کے آفریدی ۵۴۰۰ روپے مواجب کے عوض کوتل سے آخور اور باسی خیل کے حدود تک سڑک کی حفاظت کے ذمہ دار ہونگے۔

(ج) باقی سڑک کی حفاظت کیلئے باسی خیل کو ۶۰۰ روپے کے سالانہ مواجب دیئے جائیں گے۔[8]

جرگہ نے ان شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اسے ایک سیاسی چال سمجھتے ہوئے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ جب چیف کمشنر کو جرگے کی واپسی کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے ہرکارے جرگہ کے پاس بھجوائے لیکن آدم خیل زعماء نے ان شرائط کی بنیاد پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا اس کے بعد حکومت نے آدم خیل کو یہ متبادل تجویز پیش کی کہ وہ ۵۷۰۰ روپے مواجب کے بدلے تمام سڑک کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں لیکن جرگہ نے اس تجویز کو اسی بنا پر رد کردیا کہ ۱۸۴۹ء میں انہیں کوتل پوسٹ سے ایمل چبوترہ تک سڑک کی حفاظت کیلئے اتنی ہی رقم ملتی تھی۔ جب صلح کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو چیف کمشنر نے ناکہ بندی کے احکامات جاری کردیئے۔ درہ کوہاٹ کے چاروں طرف فوج کے مسلح پہرے بٹھا دیئے گئے غذائی اجناس اور روزمرہ استعمال کی اشیاء کی نقل وحمل پر پابندیاں عائد کردی گئیں اور اس کے ساتھ ہی ان کے مواجب بھی بند کردیئے گئے لیکن اس کے باوجود یہاں کے قبائل نے سر تسلیم خم نہ کیا۔

اب انگریز نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالا اور آفریدیوں کو قبیلہ بنگش کے خلاف صف آرا کرنے کی مذموم کوشش کی۔ حکومت نے کیپٹن کوک کی تجویز پر قبیلہ اورکزئی کے بجائے قبیلہ بنگش کو سڑک کی حفاظت کیلئے ۷۷۰۰ روپے مواجب دینے کا فیصلہ کیا اور انہیں کوتل میں دو پرانی اور تین نئی چوکیاں بنانے کا کام سپرد کیا۔ بنگش قبائل فرسٹ پنجاب اور تھرڈ پنجاب انفنٹری کی مدد سے کوتل کی چوکی تک پہنچے اور دو چوکیوں کی تعمیر کا کام شروع کیا لیکن اسی سوال پر آفریدیوں نے قبیلہ بنگش کے ساتھ بھی محاذ آرائی سے گریز نہیں کیا اور ۱۲ نومبر ۱۸۵۳ء کو کوتل کے مقام پر ان پر ایسا اچانک حملہ کیا جس سے بنگش قبائل کے پیر اکھڑ گئے اور وہ کوتل چھوڑ کر سیدھے انگریزی فوج کے

کیمپ میں جا پہنچے۔[9] اگرچہ انگریزوں نے بنگش قبائل کو آفریدیوں کے خلاف اکسایا اور ان کی ہمت بندھائی لیکن انہوں نے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے آفریدیوں کے خلاف انتقامی کاروائی سے گریز کیا۔

انگریز اس بات کے متمنی تھے کہ آدم خیل کے خلاف بنگش قبائل کے جذبات بھڑکائے جائیں لیکن جب ان کی مطلب براری نہ ہوئی تو پھر انہوں نے دولت زئی، سپایہ اور جواکی قبائل کو بنگش قبیلے کی مدد کیلئے بلایا۔ ان قبائل کے ساتھ دسمبر ۱۸۵۳ء میں ایک معاہدہ کیا گیا جس کے تحت جواکی قبائل کو ۲ ہزار روپے، بیزوٹی قبائل کو کوہاٹ سے کوتل تک سڑک کی حفاظت کیلئے دو ہزار روپے، سپایہ قبائل کو پانچ سو روپے اور بنگش قبائل کو ۲۲۰۰ روپے کے مواجب منظور کئے گئے۔ اس کے علاوہ کیپٹن کوک نے خواجہ محمد خان (آ) کی وساطت سے قبیلہ خٹک کی مدد حاصل کی اور سڑک کی تعمیر کا کام ازسرنو شروع کیا گیا لیکن آفریدیوں نے ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس حملہ میں قبیلہ بنگش کے تین سرکردہ زعماء کام آئے اور کئی افراد زخمی ہوئے اس کے علاوہ کیپٹن کوک اور اس کے تین ساتھیوں کے بھی زخم آئے۔[10] یوں دشمن اپنی عیاری سے قبائل کے درمیان پھوٹ ڈال کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا لیکن درہ کے آفریدیوں نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کوتل سے کوہاٹ تک کی سڑک سے دستبرداری اختیار کی اور اپنے ہم وطنوں کے ساتھ محاذ آرائی کی بجائے کوتل کے پہاڑی

(آ) خواجہ محمد خان ٹیری کے نواب تھے۔

علاقہ پر قبیلہ بنگش کا دعویٰ تسلیم کر لیا۔ یکم دسمبر ۱۸۵۳ء کو گلی اور حسن خیل آفریدیوں نے انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کے تحت کوتل سے کوہاٹ تک کے علاقے پر بنگشوں کا دعویٰ تسلیم کیا گیا اور انہیں وہاں چوکیاں بنانے کی اجازت دی گئی۔ اس کے علاوہ وہ اس بات پر بھی آمادہ ہو گئے کہ اخوروال درہ کے سڑک کی حفاظت کیلئے ایمل چبوترہ کی چوکی میں پندرہ آدمی اور وارسک اور روحی وارسک کی چوکیوں میں پانچ پانچ چوکیدار رکھیں گے۔ اس طرح زرغن خیل، شیراکی اور تورسپری راغوتنگی کی چوکی میں دس اور سنڈہ بستہ، شیراکی اور کوتل کے درمیان واقع چوکیوں میں پانچ پانچ چوکیدار رکھیں گے۔[11] ۱۸۵۳ء میں کوتل (غاخی) اور درے کی سڑک کی حفاظت کیلئے تیرہ ہزار چار سو روپے (۱۳۴۰۰) کے مواجب دئے جاتے تھے۔ اس میں سے ۵۷۰۰ روپے اخوروال، زرغن خیل تورسپری، شیراکی، بوستی خیل اور باسی خیل قبائل کو اور ۷۷۰۰ روپے بہادر شیر خان بنگش، قبیلہ بنگش، اور کزئی ایجنسی کے فیروز خیل اور بیزوٹی، سپایہ اور جواکی قبائل کو دئے جاتے تھے۔ حکومت نے ۵۸-۱۸۵۷ء میں بہادر شیر خان کے سالانہ مواجب میں ۱۲۰۰ روپے کا اضافہ کیا اور اس طرح قبیلہ بنگش کے سالانہ مواجب ۴۴۰۰ تک پہنچ گئے۔ اس میں سے ۲۴۰۰ روپے بہادر شیر خان اور باقیماندہ رقم قبیلہ بنگش کو دی جاتی تھی۔

۱۸۵۳ء سے لے کر ۱۸۶۵ء تک ماسوائے چند روز بندش کے درہ کوہاٹ کی سڑک پر حسب معمول آمدورفت جاری رہی۔ کیپٹن منرو نے ستمبر ۱۸۵۹ء اور کیپٹن ہینڈرسن نے ستمبر ۱۸۶۰ء میں درہ کی سڑک چند دنوں کیلئے بند کی۔[12] ۱۸۶۳ء میں بولا کی خیل اور گڈیا خیل کے درمیان لڑائی شروع ہونے پر ۱۸ فروری ۱۸۶۵ء کو سڑک پر آمدورفت معطل ہو گئی جو تقریباً ایک سال نو مہینے کی بندش کے بعد دوبارہ آمدورفت کیلئے کھولی گئی۔[13]

نومبر ۱۸۶۶ء سے ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء تک حالات پر سکون رہے اور درہ کی سڑک پر آزادانہ آمدورفت جاری رہی لیکن ۱۵ اپریل ۱۸۷۰ء کو درہ کے لوگوں نے کیپٹن سٹین فورتھ کے ایک ملازم اور دو سرکاری اہلکاروں کو قتل کر دیا۔[۱۴] اس جرم کی پاداش میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر سی۔اے۔میکائے نے کوہاٹ میں درہ کے قبائل کو گرفتار کرنا شروع کر دیا اور ان کے دس ہزار روپے کے مال مویشی اور نمک سے لدے ہوئے اونٹوں پر بھی قبضہ کیا۔ حکومت نے گلی قبائل سے جرمانے کے ادائیگی کا مطالبہ کیا لیکن وہ جرمانہ ادا کرنے پر راضی نہیں ہوئے البتہ آدم خیل جرگہ نے بوستی خیل میں ملک باشو اور شیر دل اور زرغن خیل میں یاسین کے گھروں کو مسمار کرنے اور مقتولین کے ورثا کو تین ہزار روپے خون بہا ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ قتل کے اس واقعہ میں نظر علی زخاخیل بھی ملوث تھا جسے گرفتاری کے بعد ۱۹ اگست ۱۸۷۰ء کو کوتل (غاخی) میں پھانسی دی گئی۔

انگریز درہ کوہاٹ پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی فکر میں تھے اسلئے ۱۸۷۵ء میں انہوں نے سڑک کی تعمیر کا مسلہ ازسرنو کھڑا کیا اور اسی مسلہ پر درہ کے قبائل کے تعلقات انگریزوں سے ایک بار پھر کشیدہ ہوگئے انگریز اپنے مقاصد کے حصول کیلئے درہ میں پکی سڑک کی تعمیر ضروری سمجھتے تھے مگر آفریدی اسے اپنی آزادی کے خلاف ایک گھناؤنی سازش گردانتے تھے۔ حکومت کی خواہش تھی کہ مذکورہ سڑک تانگوں کی آمدورفت کیلئے کشادہ کی جاسکے اسلئے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن کیوگناری نے ۱۸۷۵ء میں آدم خیل سے مطالبہ کیا کہ وہ خود ہی سڑک کو کشادہ کریں ورنہ مواجب لینا چھوڑ دیں۔[۱۵] اگر چہ درہ کے کچھ لوگ پکی سڑک بنانے کے حق میں تھے لیکن شیراکی اس کے خلاف تھے اور انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو سڑک پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔حکومت نے

۴ فروری ۱۸۷۶ء کو ان کا ایک جرگہ کوہاٹ میں بلایا لیکن شیراکی قبیلہ بنگش کے سردار بہادر شیر خان کے ہرکاروں کے ساتھ سختی سے پیش آئے اس لئے حکومت نے ۷ فروری کو درہ کی ناکہ بندی کی جو مارچ ۱۸۷۷ء تک جاری رہی۔[۱۶] درہ کے قبائل نے اس کاروائی سے مشتعل ہو کر ۱۶ فروری ۱۸۷۶ء کو کوتل میں ان چوکیوں کو نذر آتش کر دیا جن کی حفاظت کی ذمہ داری جواکی اور کزئی قبائل کو سونپی گئی تھی۔اس کے جواب میں انگریزوں نے ۱۵ اپریل ۱۸۷۶ء کو قلم سدہ میں حسن خیل کی فصلیں کاٹ ڈالیں۔ آخر ۲ فروری ۱۸۷۷ء کو فریقین میں صلح ہوگئی اور آدم خیل مارچ ۱۸۷۷ء میں کوتل سے شمال کی طرف سڑک کو کشادہ کرنے اور تین ہزار روپے جرمانہ ادا کرنے پر راضی ہوگئے۔ شیراکی اور بوستی خیل نے ان شرائط کے ماننے سے انکار کیا۔آخر کار حکومت شیراکی اور بوستی خیل کے مواجب میں ۴۸۰ روپے کا اضافہ کرنے پر مجبور ہوئی جس کے بعد ۲۴ مارچ ۱۸۷۷ء کو درہ کی سڑک آمدورفت کیلئے کھول دی گئی۔

۲۴ مارچ ۱۸۷۷ء کو پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر نے پشاور میں ایک دربار کے موقع پر قبیلہ بنگش کے سردار بہادر شیر خان کو ان کی خدمات کے صلہ میں نواب کا خطاب دینے کے علاوہ خلعت بھی عطا کی۔ ساتھ ہی دوسرے قبائلی زعماء کو بھی انعام واکرام سے نوازا گیا جنہوں نے انگریزوں کی مدد اور معاونت کی تھی۔اس دربار کے چند ہی ماہ بعد انگریزوں اور گڈیا خیل کے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔۱۴ اگست ۱۸۷۷ء کو انگریزی فوج نے ان کی بستیوں پر شبخون مارا اور ان کو اپنے گھروں میں محصور کر دیا۔ گڈیا خیل نے جب صلح کیلئے بات چیت شروع کی تو کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے مطالبہ کیا کہ قبیلہ کے تمام مسلح افراد حکومت کے حوالے کر دیئے جائیں بعد میں انگریزوں نے ۱۲۷ افراد کو گرفتار کیا اور ارباب اقتدار ان کے

سومویشی بھی اپنے ساتھ لے گئے۔[۱۷]

جون ۱۸۷۹ء میں کیپٹن پلاؤڈن نے حکومت کو تجویز پیش کی کہ اگر درہ کے مواجب میں تین ہزار روپے کا اضافہ کر دیا جائے تو قبائل پکی سڑک کی تعمیر پر معترض نہیں ہونگے۔ اس کے ساتھ ساتھ کوتل کی پہاڑیوں میں ایک سرنگ نکالنے کی تجویز پر بھی غور شروع ہوا۔ کوہاٹ کے ایگزیکٹیو انجنیئر میجر آرمز سٹرانگ نے اس سرنگ کی لمبائی کا اندازہ چارسو گز اور فی گز تعمیر کا تخمینہ دوہزار روپے لگایا تھا[۱۸] لیکن اس پر عملدر آمد نہ ہوسکا۔

حکومت پاکستان نے ۱۹۷۷ء میں کوہاٹ ہائی وے (آ) ٹنل کے نام سے ایک منصوبہ بنایا جس کے تحت ۲۰۸ ملین روپے کی لاگت سے درہ کوہاٹ کے پہاڑی سلسلہ میں ۱۲۵۰ میٹر لمبی اور ۱۰ میٹر چوڑی دو متوازی سرنگیں تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا مگر رقم کی کمی کی وجہ سے اس منصوبے پر عملدر آمد نہ ہوسکا اس سرنگ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے جاپان کے او-ای-سی-ایف (اوورسیز اکنامک کوآپریشن فنڈ) کی مدد سے انڈس ہائی وے کے منصوبے کے تحت کوتل کی پہاڑیوں میں چھ ارب باسٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ روپے (66,260) کی لاگت سے تقریباً 1.9 کلو میٹر لمبی اور 9.4 میٹر چوڑی سرنگ بنانے کا منصوبہ بنایا وزیر اعظم محمد [illegible] نے 30 جولائی 1999 کو اس منصوبے کے تعمیراتی کام کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ یہ منصوبہ چار سال میں

(آ) کوہاٹ ہائی وے ٹنل کی تفصیلات ماہنامہ کمیونیکیٹر مطبع جولائی ۱۹۷۷ء میں ۳۶-۴۳ صفحات پر ملتی ہیں۔

(ب) انڈس ہائی وے ٹنل سے متعلق معلومات بیزی ورلڈ انٹرنیشنل نامی جریدے کے ماہ اکتوبر ۱۹۹۵ء کے شمارے میں ۲۳-۳۲ نمبر صفحات پر مل سکتی ہیں۔

مکمل کیا جائیگا۔ ہمارے ملک میں یہ اپنی طرز کا جدید سرنگ ہوگا جس میں روشنی، ہوا، تحفظاتی نظام اور دیگر جدید سہولتیں موجود ہونگیں۔

۱۸۴۹ء سے ۱۸۸۳ء تک انگریزوں نے آدم خیل قبائل سے بالمشافہ بات چیت نہیں کی بلکہ قبیلہ بنگش کے نواب بہادر شیر خان فریقین کے مابین رابطے کے فرائض انجام دیتے رہے اس مقصد کیلئے حکومت انہیں ۲۴۰۰ روپے سالانہ الاؤنس دیتی تھی۔ بہادر شیر خان کی وفات کے بعد ۱۸۸۰ء میں انگریزوں اور آدم خیل قبائل کے درمیان رابطے کا کام ان کے بھائی عطا محمد خان کو اتنے ہی الاؤنس کے عوض سونپا گیا لیکن ۱۸۸۲ء میں انگریزوں نے آدم خیل کے ساتھ بلاواسطہ بات چیت کرنے کا فیصلہ کیا اور جون ۱۸۸۲ء میں عطا محمد خان کا الاونس بند کر دیا گیا۔ انگریز پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی حکمت عملی کے تحت بنگش، اور کزئی اور آفریدی قبائل کو آپس میں لڑانے میں کامیاب ہوگئے تھے اور اب انہیں بنگش یا اورکزیوں کی خدمات اور مدد کی ضرورت نہ تھی لہذا انہوں نے قبیلہ بنگش کے الاؤنس بند کر دیئے۔

مئی ۱۸۸۳ء میں حکومت نے نمک پر ٹیکس لگانے کا فیصلہ کیا چونکہ نمک کی تجارت آدم خیل قبائل کے آمدن کا بڑا ذریعہ تھی (آ) اسلئے انہوں نے اس فیصلے کے خلاف شدید

(آ) انیسویں صدی عیسوی میں نمک کی تجارت آدم خیل قبائل کے آمدن کا بڑا ذریعہ تھی اور ان کی تجارت کا دائرہ پشاور، باجوڑ، سوات اور کابل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے اونٹ پال رکھے تھے اور درہ کے آفریدیوں میں زیادہ اونٹ شیرا کی اور زرغن خیل کے پاس تھے۔

عمل کا اظہار کیا اس سے قبل کوہاٹ کی نمک کی کانوں میں ایک من نمک کی قیمت دو سے چار آنے تھی لیکن جولائی ۱۸۸۳ء میں ایک من نمک کی قیمت آٹھ آنے مقرر کی گئی اس کے ساتھ ساتھ علاقے کے تمام تاجروں اور افغانیوں کو بھی نمک کی آزادانہ تجارت کی اجازت دی گئی۔ درہ کے آفریدیوں خصوصاً شیرا کی اور بوستی خیل نے حکومت کے اس اقدام کو اپنے مفادات کے منافی سمجھا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ زرغون خیل کے ملک خانی (آ) اور آخور کے ملک جبار نے بھی نمک کی قیمت میں اضافے کی مخالفت کی۔[19] اسی سلسلے میں حکومت نے ایک جرگہ بلایا جس سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا حکومت نے درہ کے آفریدیوں کے مخاصمانہ رویئے کے پیش نظر جولائی ۱۸۸۳ء سے ان کے مواجب بند کرنے کا فیصلہ کیا آخر، ستمبر ۱۸۸۳ء میں مصری خیل کے علاوہ درہ کے باقی قبائل نے درہ کی سڑک پر نمک کی تجارت جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

انگریز درہ میں پکی سڑک کی تعمیر کیلئے کسی موزوں موقع کی تلاش میں تھے اور حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے ۲۳ اگست ۱۸۹۹ء کو سڑک کی تعمیر کا سوال از سر نو اٹھایا۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن نے حکومت پنجاب کو ہدایت کی کہ درہ

(آ) ملک خانی کا شمار درہ آدم خیل کے سرکردہ قبائلی زعماء میں ہوتا تھا۔ حکومت پنجاب کے ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کے ایک نوٹیفیکیشن کے مطابق انہیں کوہاٹ میں منعقدہ ایک دربار کے موقع پر ۲۰۰ روپے کی خلعت عطا کی گئی۔ آپ ۱۹۰۰ء میں وفات پا گئے اور آپ کے فرزند ملک فیروز خان آپ کے جانشین مقرر ہوئے۔

کے قبائل کو یقین دہانی کرائی جائے کہ سڑک تعمیر کرنے کی صورت میں حکومت نہ تو ان کے ساتھ اپنے تعلقات میں کوئی تبدیلی لائے گی اور نہ ان کے داخلی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کرے گی اور قبائل چاہیں تو سڑک کا ٹھیکہ بھی انہی کو دے دیا جائیگا۔ حکومت پنجاب نے اسی سلسلہ میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کو ایک جرگہ بلانے اور اس سے بات چیت کرنے کی ہدایت کی۔ حسب ہدایت ڈپٹی کمشنر نے کوہاٹ میں ایک نمائندہ آدم خیل جرگہ سے ملاقات کی اور کئی روز کے طویل مذاکرات کے بعد جرگہ نے پندرہ دن کی مہلت مانگی۔ جرگہ نے ۱۸ ستمبر ۱۸۹۹ء کو درہ میں اس شرط پر پکی سڑک تعمیر کرنے کی اجازت دے دی کہ درہ کے لوگوں کے مواجب میں تین ہزار روپے کا اضافہ کیا جائیگا۔ قابل کاشت زمین پر سڑک کی تعمیر کے عوض متاثرین کو مناسب معاوضہ ملے گا اور درہ میں ٹیلیگراف یا ریلوے لائن بچھانے کے سلسلے میں وہاں کے قبائل کی مرضی کا خیال رکھا جائیگا۔[20] اس کے بعد حکومت پنجاب نے درہ کے مواجب میں اضافے کی سفارش کی۔ پہلے پہل لارڈ کرزن اس تجویز کے حق میں نہیں تھے لیکن بعد میں انہوں نے حکومت پنجاب کی سفارشات کو قبول کیا اور اس کے ساتھ ہی درہ میں پکی سڑک کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ سڑک کا ٹھیکہ درہ کے بااثر ملکوں کو دیا گیا اور یہ سڑک دو سال کے اندر مکمل ہو گئی۔ پکی سڑک کی تعمیر پر درہ کے قبائل کے مواجب میں جو اضافہ کیا گیا تھا اس میں سے ایک ہزار روپے شیرا کی اور بوستی خیل کو۔ ایک ہزار روپے زرغون خیل کو، ۷۵۰ روپے آخوروال کو اور ۲۵۰ روپے تورسپری قبائل کو دیئے گئے اسی طرح ۱۹۰۱ء میں درہ کے کل مواجب ۸۵۴۰ روپے تک پہنچ گئے۔ اس رقم میں سے ۲۹۰۰ روپے آخوروال کو، ۱۹۵۰ روپے زرغون خیل کو، ۱۲۱۵ روپے بوستی خیل کو، ۱۲۱۵ روپے شیرا کی کو، ۱۲۰۰ روپے تورسپر کو اور ۶۰ روپے شیلکی کو دیئے گئے۔ ان مواجب کے علاوہ ملک ستار کو ۶۰ روپے

ملک فیروز خان اور ملک اولس خان زرغن خیل کو تیس، تیس (۳۰) روپے ڈاک الاؤنس بھی دیا جانے لگا۔ [۲۱]

۱۸۹۹ء سے ستمبر ۱۹۱۰ء تک حکومت اور درہ کے آفریدیوں کے تعلقات میں کوئی خاص کھچاؤ اور ٹھہراؤ نہیں تھا البتہ ۱۹۱۰ء میں اسلحہ کی سمگلنگ کی روک تھام کیلئے سرکاری سطح پر جو اقدامات کئے گئے ان سے درہ کے قبائل کو سخت مالی نقصان پہنچا اسلئے انہوں نے انتقامی کاروائی کے طور پر ۳ ستمبر ۱۹۱۰ء کو آخور کی حدود میں ایک سرکاری تانگے پر حملہ کیا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ انگریزوں کو سڑک پر سے نہیں گزرنے دیں گے۔ اسی طرح یہ سڑک ایک بار پھر ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء تک آمدورفت کیلئے بند رہی۔

پہلی جنگ عظیم میں آدم خیل قبائل نے اپنے مسلمان ترک بھائیوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا تھا اسلئے حکومت نے ۱۳۰ بلوچی پلٹن میں خدمات انجام دنے والے آدم خیل قبائل کو کالے پانی کی سزا دی تھی۔ حکومت کے اس فیصلے کے خلاف رد عمل ایک قدرتی بات تھی اسلئے سزا یافتہ سپاہیوں کے رشتہ داروں نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزوں کو یرغمال بنا کر اپنے رشتہ داروں کو چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ حکومت کو جب درہ کے قبائل کے ارادوں سے آگاہی ہوئی تو چیف کمشنر نے ۳ مارچ ۱۹۱۵ء کو اس سڑک پر انگریزوں کی آمدورفت بند کر دی مگر ۱۱ مارچ ۱۹۱۵ء کو کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر اے۔ ایچ گرانٹ سے جرگہ کے ملاقات کے بعد سڑک ٹریفک کیلئے کھول دی گئی۔ [۲۲] ۱۹۱۹ء میں افغانستان کی تیسری جنگ کے موقع پر آدم خیل کے مفاہمانہ رویئے کی بنا پر حکومت نے ۱۹۱۹ء میں گلی اور جواکی قبائل کے مواجب میں سو فیصد اضافہ کیا اور ای طرح گلی اور اخوروال کے مواجب ۱۷۰۸۰ اور جواکی کے مواجب ۳۶۹۹۶ روپے ہو گئے۔ [۲۳]

حکومت نے مئی ۱۹۲۳ء میں بوستی خیل، شیرا کی اور سنی خیل پر مس ایلس کے اغوا کے سلسلہ میں پچاس ہزار روپے کا جرمانہ لگایا۔ ۱۹۲۴ء میں زرغن خیل کے دوشاخوں کے درمیان لڑائی کے موقع پر کچھ افراد سڑک پر گولی لگنے سے ہلاک اور زخمی ہوئے اس لئے حکومت نے لڑائی میں ملوث فریقین کو دس ہزار روپے جرمانہ کیا۔ ۱۹۲۶ء میں حکومت اور آدم خیل کے درمیان سڑک کی حفاظت کیلئے ایک نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت درہ آدم خیل کے آفریدی اس بات پر رضا مند ہوئے کہ وہ سڑک پر کسی فرد کو ہلاک کرنے کی صورت میں پانچ ہزار روپے، زخمی کرنے کی صورت میں ڈھائی ہزار روپے اور لڑائی کے دوران سڑک کے آرپار گولیاں چلانے کی صورت میں ایک ہزار روپے جرمانہ ادا کریں گے یہ معاہدہ درہ کے قبائل نے اپنی مرضی سے کیا تھا جس کے نتیجہ میں سڑک پر نقل و حمل کافی محفوظ ہو گئی۔ [۲۴]

جواکی

انگریز خوب جانتے تھے کہ آدم خیل اور دیگر قبائل کے درمیان یکجہتی کی صورت میں انہیں شکست دینا کافی دشوار ہوگا اسلئے انہوں نے پہلے ان کے درمیان اختلافات کی دیواریں کھڑی کیں اور پھر باری باری سب کو جارحیت کا نشانہ بنایا۔ انگریزوں نے آدم خیل شاخ کے آفریدیوں کے اردگرد حصار قائم کرنے کی غرض سے ۱۸۶۲ء میں شرکیرہ میں فورٹ میکسن (آ) (قلعہ کشن گڑھ) کی تعمیر شروع کی اس قلعے کی تعمیر کا بڑا مقصد یہ تھا کہ درہ کوہاٹ کا شمالی علاقہ ان کی گرفت میں ہو اور آدم خیل کی ناکہ بندی اور ان پر فوج کشی کی صورت میں انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

(آ) کشن گڑھ کا قلعہ پشاور ڈویژن کے پہلے کمشنر لفٹیننٹ کرنل فریڈرک میکسن (جو کشن کاکا کے نام سے مشہور تھے) کے دور میں قبائل کے حملوں کے تدارک کیلئے تعمیر کیا گیا تھا جس میں پانچ سو جوانوں پر مشتمل فوج رکھنے کی گنجائش تھی۔ یہ قلعہ پشاور کے جنوب مغرب میں تقریباً سترہ (۱۷) میل اور درہ کوہاٹ کے شمال میں ساڑھے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا اس قلعہ کی دیواریں چھ (۶) فٹ موٹی اور تقریباً ۲۵ فٹ اونچی تھیں اس کا صدر دروازہ دس (۱۰) فٹ چوڑا اور بارہ (۱۲) فٹ اونچا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں یہاں بارڈر ملٹری پولیس کا ۲۹ جوانوں پر مشتمل ایک دستہ رکھا گیا تھا۔ یہاں بعد میں ایڈیشنل پولیس کا ایک دستہ تعینات کیا گیا۔ اب یہ قلعہ خستہ حالی کی وجہ سے منہدم ہو چکا ہے تاہم اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔

انگریزوں نے نومبر ۱۸۵۳ء میں جواکی زعماء کو اسی شرط پر سرکاری علاقہ میں نمک کی تجارت جاری رکھنے کی اجازت دی تھی کہ نہ تو وہ انگریزوں پر حملہ کریں گے اور نہ مفروروں کو اپنے ہاں پناہ دیں گے بالفاظ دیگر انگریزوں کا مدعا یہ تھا کہ جواکی قبائل ان مفروروں کو جنہوں نے ان کے ہاں پناہ لی تھی اپنے علاقے سے نکال دیں یا انہیں حکومت کے حوالے کر دیں۔ چونکہ ایسا کرنا پختونولی کے اصولوں کے منافی تھا اسلئے جواکی قبائل نے اس شرط کو مسترد کر دیا۔ انگریز جواکی قبائل کے اس رویئے پر اس قدر سیخ پا ہوئے کہ انہوں نے ان پر ایک بڑا حملہ کرنے کیلئے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ انگریزی فوج نے ۲۰ نومبر ۱۸۵۳ء کو کرنل ایس۔ بی۔ بائیلیو کی سرکردگی میں سرغاشی درہ کی طرف سے علاقہ جواکی پر حملہ کیا لیکن جونا کوڑ، کوہی اور تڑونی میں جواکی قبائل کی مزاحمت نے حملہ آور فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ فوج نے واپسی پر ان کے گھروں کو مسمار کیا۔ کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی اور ان کے مال مویشی بھی ساتھ لے گئی۔[25] اس جنگ کے متعلق زرداد خان ناغر لکھتے ہیں۔ "یہاں کی لڑائی بہت مشکل تھی اور بباعث خاصہ زمین انگریزی فوجوں کو بہت نقصان ہوا"۔ اس لڑائی کے بعد انگریز نے مصالحانہ روش کی آڑ میں بھائی کو بھائی سے لڑوانے کی ایک مذموم سازش کی۔ ۳ دسمبر ۱۸۵۳ء کو جواکی قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے تحت ان کو دو ہزار روپے کے مواجب اسی شرط پر دیئے کہ وہ کوتل (غاخی) کی سڑک کی حفاظت کیلئے کوتل کی چوکی میں بارہ مسلح افراد رکھیں گے اور گلی اور بنگش قبیلوں کے درمیان لڑائی میں بنگش کا ساتھ دیں گے۔[26] ۱۸۷۶ء تک اکا دکا جھڑپوں کے باوجود بھی جواکی قبائل کو مواجب ملتے رہے لیکن فروری ۱۸۷۶ء میں گلی آفریدیوں نے کوتل میں جواکی کی خالی شدہ چوکی کو مسمار کر دیا اس حملے نے شکوک و شبہات کو جنم دیا اور انگریزوں نے جواکی قبائل

سے اچھے سلوک کی ضمانت طلب کی۔ انگریزوں کے خیال میں جواکی قبائل نے اپنی ذمہ داریوں سے لاپرواہی برتنے کے ساتھ ساتھ درپردہ گلی آفریدیوں کی حمایت کی تھی اسلئے انہوں نے ان کے مواجب میں کمی کرنے کی ایک تجویز پر غور شروع کیا۔ پیگٹ اور میسن کے مطابق جواکی قبائل نے حکومت کے فیصلے کا انتظار کرنے کی بجائے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور ۱۵ جولائی ۱۸۷۷ء کو خوشحال گڑھ اور کوہاٹ کے درمیان مختلف مقامات پر ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے۔[27] اسی سلسلہ میں حکومت نے جواکی قبائل کا ایک جرگہ بلایا لیکن انہوں نے حکومت کو جواب بھیجا کہ اگر وہ جرگہ کرنا چاہتی ہے تو قبیلہ بنگش کا ایک جرگہ ان کے ہاں بھیجا جائے۔ جواکی قبیلہ کے اس سخت روئیے پر انگریز اتنے برہم ہوئے کہ ضلع کوہاٹ میں ان کے ۹۳ افراد کو گرفتار کرلیا اور ان کی املاک پر قبضہ اور ان کے مال مویشی کو بطور برآمتہ رکھا۔ جواکی قبائل نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور ۲۴ جولائی ۱۸۷۷ء کو پولیس کے اس دستے پر حملہ کیا جو جواکی کے دو گرفتار شدہ افراد کو اپنے ساتھ لے جارہا تھا انہوں نے نہ صرف اپنے ساتھیوں کو پولیس کے چنگل سے چھڑایا بلکہ وہ پولیس کے تین سپاہی بھی بطور یرغمال اپنے ساتھ لے گئے۔ اس واقعہ کے بعد انگریزوں نے پھر جواکی قبائل کا جرگہ بلایا لیکن اس دفعہ بھی وہ جرگہ کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور انہوں نے ۲۸ جولائی کو ٹیلیفون کے مزید تار کاٹ دیئے اس کے جواب میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے ملک بابری (آ) کی پنشن معطل کرنے اور علاقہ سرکار میں جواکی قبائل کی املاک پر قبضہ کرنے کی دھمکی دی۔[28]

(آ) بابری بانڈہ کی بنیاد ملک بابری نے رکھی تھی۔

آخر ۳۰ جولائی ۱۸۷۷ء کو جواکی کا ایک جرگہ کوہاٹ آیا اس جرگے نے پولیس کے تین سپاہیوں کی واپسی کے علاوہ تین سو روپے جرمانہ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن جواکی قبائل کے کشران (نوجوان) کسی قیمت پر جرمانہ ادا کرنے پر تیار نہیں تھے اسلئے ۱۷ اگست ۱۸۷۷ء کو خوشحال گڑھ کے قریب ۳۶ سرکاری خچر پکڑ کر اپنے علاقہ میں لے گئے۔ اسی شب انہوں نے خوشحال گڑھ کی سڑک پر متعین سپاہیوں کے ایک دستے پر حملہ کیا اور ان میں سے تین کو ہلاک کرنے کے علاوہ ٹیلیفون کے تار بھی کاٹ دیئے۔ جواکی اب ان لوگوں کے بھی جانی دشمن بن گئے جو انگریزوں کے ہمنوا تھے اسی سلسلے میں انہوں نے ۱۹ اگست ۱۸۷۷ء کو گنڈیالی پر حملہ کیا اور متعدد گھروں کو جلایا۔ جب حالات نے نازک صورت اختیار کرلی تو بہادر شیر خان بنگش نے آدم خیل کا ایک نمائندہ جرگہ بلانے کیلئے اپنے ہرکارے دوڑائے لیکن جواکی قبائل کے ہیبت خیل اور قیمت خیل نے یہ شرط پیش کی کہ جب تک انگریز ان کی چھ شرائط نہیں مانیں گے وہ انگریزوں کے ساتھ جرگہ کرنے پر آمادہ نہیں ہونگے۔ جواکی قبائل نے سرکاری علاقے پر اپنے حملے جاری رکھے اور ۲۰ اگست ۱۸۷۷ء کو ان کے ایک لشکر نے ایک رسالے اور پیدل فوج کے ایک دستے پر حملہ کیا اور ٹیلیفون تار بھی کاٹ دیئے۔

۲۷ اگست کو انہوں نے خوشحال گڑھ کے پل کو جلایا اور دو دن بعد خوشحال گڑھ کے دوسرے پل کو جلانے کی کوشش کی۔ جواکی قبائل کے لگاتار حملوں سے تنگ آکر انگریزوں نے قیمت خیل، پایہ اور دیگر جواکی قبائل کے خلاف فوجی کاروائی کرنے کا حکم دیا اس وقت ملک بابری اور مشکئی اور پایہ کے ذال بیگ جواکی کے سرکردہ ملک تھے۔

انگریزوں نے ۲۹ اگست ۱۸۷۷ء کو درہ تور تنگ کے راستے علاقہ جواکی پر حملہ کیا لیکن قبائل نے حملہ آور فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ انگریز قیمت خیل کے علاوہ باقی جواکی

قبائل کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے[29] اور اسی طریقہ سے ان کی یہ مہم ناکامی کا شکار ہو گئی۔اس حملے کے نتیجہ میں دشمن پر جواکی قبائل کے حملوں میں مزید شدت آ گئی۔

۹ ستمبر ۱۸۷۷ء کو وہ ضلع کوہاٹ سے کئی اونٹ لے گئے اس واقعہ کے دوسرے روز انہوں نے ٹیلیفون کے مزید تار کاٹ دیئے چند دنوں بعد انہوں نے تھانہ شادی پور اور ۱۷ ستمبر کو کوٹلی اور شیخان پر حملہ کیا۔ ۲۴ ستمبر کو انہوں نے گمبٹ میں ایک سرکاری چوکی پر حملہ کیا اور چار سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو انہوں نے شاہ کوٹ کے نزدیک ۲۲ پنجاب نیٹیو انفنٹری پر حملہ کیا اور چودہ افراد کو زخمی اور ہلاک کرنے کے علاوہ ان کی آٹھ بندوقیں بھی چھین لیں[30]۔ طاقت کے مظاہرے سے جواکی قبائل جب مرعوب نہ ہو سکے تو انگریزوں نے ان کے خلاف ناکہ بندی کا حربہ استعمال کیا اور ان کے علاقہ میں غذائی اجناس کے لانے لے جانے پر سخت پابندی عائد کر دی۔اس کے ساتھ ہی حکومت نے ۲۸ اکتوبر ۱۸۷۷ء کو گلی، حسن خیل اور آشو خیل کا ایک جرگہ بلایا اور انہیں ہدایت کی کہ جواکی قبائل کو کسی قسم کی مدد نہ دیں اس دوران انگریزوں نے جواکی پر ایک بڑے حملے کیلئے جنرل روز اور بریگیڈئر سی۔ بی۔ کائے کی سرکردگی میں ایک بڑی فوج جمع کی۔بریگیڈئر کائے کی فوج تین حصوں پر مشتمل تھی۔ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اس فوج کا پہلا دستہ درہ تورتنگ کے راستے اور دوسرا دستہ گنڈیالی کی طرف سے علاقہ جواکی پر حملہ آور ہوا۔ تیسرے دستے نے شادی پور کی طرف سے درہ نمونگ کے راستے حملہ کیا۔ جواکی قبائل نے دشمن کی دو بریگیڈ مسلح اور منظم فوج کا مقابلہ بڑی دلیری سے کیا لیکن مٹھی بھر غازیوں اور منظم فوج کے درمیان مقابلہ ناممکن تھا انگریزوں کے غصے کا نزلہ سب سے پہلے ملک ذال بیگ اور پایہ کے قبائل پر گرا اور اس نے ان کے گھروں کو نیست و نابود کر دیا۔ ۱۵ نومبر کو اسی فوج نے پایہ، شین ڈنڈ اور تورکی پر اور

یکم دسمبر ۱۸۷۷ء کو سپری اور جامو پر حملہ کیا جہاں تباہی اور بربادی برپا کر کے اپنی آتش انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ دوسری طرف دسمبر کے پہلے ہفتے میں تقریباً چار ہزار فوج نے جنرل روز کی سرکردگی میں کنڈاؤ اور بوڑہ پر حملہ کیا۔ چھ، سات اور آٹھ دسمبر کو اس نے بوڑہ، غریبہ، نرئی خولہ، جامو اور پستاونی میں ملک ماشکی اور دیگر جواکی قبائل کے گھروں کو مسمار کر دیا لیکن اتنے نقصانات کے باوجود بھی وہ انگریز کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

۲ جنوری ۱۸۷۸ء کو ماسوائے ملک ماشکی کے ساٹھ (۶۰) قبائلی زعماء نے شین ڈنڈ میں بریگیڈئر کائے کے ساتھ ایک جرگہ کیا جسے انگریزوں نے جواکی کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ ان کی طاقت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور یہ کہ ان میں مزید جنگ کرنے کی سکت نہیں اسلئے انہوں نے جواکی قبائل سے دس ہزار روپے جرمانہ اور لاتعداد بندوقیں حکومت کے حوالہ کرنے کے علاوہ ان کے علاقہ میں سڑک کی تعمیر اور تورکی کے ملک ماشکی کے بھائی خیستو، پایہ کے ملک ذال بیگ کے بھائی حسن اور شیرو کی حوالگی کا مطالبہ کیا لیکن جواکی قبائل نے ان شرائط کو مسترد کرتے ہوئے جنگ جاری رکھی۔ اسی دوران جواکی قبائل کے بعض خاندانوں نے گلی آفریدیوں کے ہاں پناہ لی لیکن انگریزوں نے اس خوف سے کہ کہیں گلی اور جواکی مشترکہ طور پر ان کے خلاف محاذ آرا نہ ہو جائیں، گلی سے مطالبہ کیا کہ جواکی آفریدیوں کو ان کو حوالے کر دیا جائے۔ گلی آفریدیوں نے جب انگریزوں کی خواہش پوری کرنے سے معذوری ظاہر کی تو انہیں یہ دھمکی دی گئی کہ اگر جواکی قبائل نے آئندہ علاقہ سرکار پر حملہ کیا تو گلی قبائل اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ دریں اثنا صلح کیلئے بات چیت شروع ہو گئی اور ۴ مارچ ۱۸۷۸ء کو پشاور میں ایک دربار کے موقع پر جواکی قبائل نے پانچ ہزار روپے جرمانہ ادا کرنے، اپنے علاقہ سے چار ملکوں کو بدر کرنے اور پچیس

(۲۵) انگریزی اور پچیس (۲۵) دیسی ساخت کی بندوقیں انگریزوں کے حوالہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔[۳۱] انگریزوں نے اس دربار کے موقع پر ان آدم خیل ملکوں کو بھی انعامات دیئے جنہوں نے اس لڑائی کے دوران غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

جواکی قبائل نے پانچ ہزار روپے جرمانے کے بدلے انگریزوں کو تینتیس (۳۳) بندوقیں اور پچاس (۵۰) روپے نقد دیئے۔[۳۲] اس معاہدہ کے پندرہ روز کے اندر اندر وہ چار ملک جو انگریزوں کے کہنے پر اپنا علاقہ چھوڑ گئے تھے واپس آگئے اور شین ڈنڈ کے ملک ماشکی نے انگریزوں پر حملے بدستور جاری رکھے۔ جواکی قبائل کی قاسم خیل شاخ ۱۸۸۸ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان انگریزوں پر حملے کرتی رہی لیکن انگریزوں نے ۱۷ نومبر ۱۸۸۹ء کو شین ڈنڈ پر اچانک حملہ کر کے ملک ماشکی، اس کے ایک بھتیجے اور بعض دیگر افراد کو حراست میں لے لیا اور انہیں پانچ سال تک ڈیرہ غازی خان جیل میں قید رکھا گیا۔ آخر ۱۸۹۲ء میں انگریزوں اور جواکی قبائل کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت جواکی قبائل نے ۱۸۴۸ روپے (آ) مواجب کے بدلے سڑک کی حفاظت، اپنے علاقہ میں چار چوکیوں کی تعمیر، ان میں چار چار چوکیدار رکھنے اور درہ تور تنگ، غلام بانڈہ اور شین ڈنڈ کے راستے سفر کرنے والوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی۔[۳۳] ۱۹۱۹ء میں یہ مواجب دوچند یعنی ۳۶۹۶ روپے سالانہ کر دیئے گئے۔

(آ) یہ مواجب ۴۶۲ روپے فی خیل کے حساب سے اسماعیل خیل، قاسم خیل، ہیبت خیل اور ماول خیل کو دیئے جاتے تھے۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں حکومت نے کرنل فوکس کے قتل کے سلسلہ میں جواکی قبائل پر بارہ ہزار روپے جرمانہ عائد کیا لیکن براہ راست جرمانہ وصول کرنے میں ناکامی پر اس نے اورکزئی، علی خیل اور آفریدی قمبر خیل پر زور دیا کہ وہ جواکی قبائل کو جرمانے کی ادائیگی پر آمادہ کریں۔ اسی سلسلہ میں ۲۶ مارچ ۱۹۲۳ء کو کوہاٹ میں جواکی اور دیگر آفریدی قبائل کا ایک مشترکہ جرگہ منعقد ہوا لیکن تیراہ کے جواکی قبائل نے یہ عذر پیش کیا کہ وہ مجرموں کو سزا دینے یا ان سے جرمانہ وصول کرنے سے قاصر ہیں۔ چونکہ انگریز جرمانے کی وصولی پر مصر تھا اسلئے اپریل میں آفریدیوں کا ایک اور جرگہ ہوا جس کے فیصلے کے تحت جواکی زعماء کا ایک جرگہ تیراہ بھیجا گیا لیکن اس جرگے کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی بالآخر ۲۴ مئی ۱۹۲۳ء کو تیراہ کے جواکی قبائل نے بارہ ہزار روپے جرمانہ ادا کر دیا۔

۱۹۲۳ء میں تیراہ جواکی خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ اور اسی طرح بوڑہ کے جواکی قبائل ڈپٹی کمشنر پشاور کے زیر انتظام لائے گئے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو جواکی قبائل نے حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس میں اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو اپنے علاقے میں پناہ نہیں دیں گے۔[۳۴] ۲۲ اپریل ۱۹۲۴ء کو تیراہ جواکی ڈپٹی کمشنر کوہاٹ کے زیر انتظام لائے گئے۔ ۳۰ اپریل ۱۹۲۵ء کو یہ حکم منسوخ کیا گیا اور جواکی حسب سابق خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کی نگرانی میں دیئے گئے۔[۳۵]

جون اور جولائی ۱۹۳۰ میں بوڑہ اور پستاونی کے جواکی قبائل نے اکبر [illegible] اور جزوبہ کے دیہات پر حملے کئے اسلئے حکومت نے ۱۹۳۰ء کے آخر تک ان کے مواجب معطل رکھے۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۱ء میں بوڑہ اور پستاونی کا علاقہ پشاور کے ڈپٹی کمشنر کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہاں کے قبائل نے ۲۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا جسے انتظامی معاملہ قرار

دیتے ہوئے حکومت نے مسترد کر دیا۔[36]

حسن خیل اور آشو خیل

گلی اور جواکی آدم خیل کی طرح حسن خیل اور آشو خیل بھی انگریزوں کیلئے مشکلات کا باعث بنے رہے اگرچہ حکومت نے نومبر ۱۸۵۳ء میں جوناکوڑ، کوہی، کنڈاؤ، کنڈر، تژونی اور موسیٰ درہ کے آفریدیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی حسن خیل سرکاری چوکیوں پر حملے کرتے رہے۔ ان کے مخالفانہ رویئے کے پیش نظر ۱۸۶۶ء میں انگریزوں نے ان کی ناکہ بندی کی جس کے جواب میں حسن خیل نے سرکاری چوکیوں پر حملے شروع کر دیئے اور ایسے ہی ایک حملے میں وہ ایک سنتری کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

۱۸۶۷ء کے شروع میں انگریزوں نے پانچ ہزار فوج کی مدد سے حسن خیل پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اپریل ۱۸۶۷ء میں حکومت اور حسن خیل کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور یوں بات کشت و خون اور لڑائی تک پہنچتے پہنچتے رہ گئی۔ ۱۸۷۶ء میں حسن خیل اور آشو خیل نے درہ میں سڑک کی تعمیر کی مخالفت کی اور سرکاری علاقے پر حملے شروع کر دیئے اسلئے ان کی دوبارہ ناکہ بندی کی گئی۔ اس کاروائی کے جواب میں حسن خیل کے نعیم شاہ نے نوشہرہ چھاؤنی میں پولیس کی ایک چوکی پر حملہ کر کے وہاں پر موجود ایک سپاہی اور حولدار کو ہلاک کیا اور ان کا اسلحہ لے کر چلتا بنا۔[37] فروری ۱۸۷۷ء میں حسن خیل اور انگریزوں کے درمیان ایک اور معاہدے پر دستخط ہوئے۔

۱۸۹۵ء تک تمام آدم خیل کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کے زیر انتظام تھے لیکن ۱۸۹۶ء میں جوناکوڑی حسن خیل اور ۱۸۹۷ء میں کنڈاؤ اور کنڈر کے آشو خیل ڈپٹی کمشنر پشاور کی

تحویل میں چلے گئے۔[38] اسی طرح ۱۹۲۳ء میں کالاخیل خیبر ایجنسی سے وابستہ کر دیئے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں حکومت نے حسن خیل اور آشو خیل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے وہ اپنے علاقہ میں خاصہ داروں کیلئے چوکیاں قائم کرنے اور عوام دشمن عناصر کو اپنے ہاں پناہ نہ دینے کے پابند ہوئے لیکن انہوں نے ۱۹۲۹ء تک انگریزوں کو اپنے علاقے میں چوکیاں تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دی۔[39]

۱۹۲۹ء میں حسن خیل اور آشو خیل نے حکومت کی ہدایت کے خلاف کوہاٹ میں سنی شیعہ فساد میں مداخلت کی اور ساتھ ہی وہ اپنے علاقے میں چوکیاں بنانے سے بھی انکار کرتے رہے اسلئے حکومت نے ان کے مواجب بند کر دیئے۔ ۱۹۲۹ء میں آشو خیل نے اپنے علاقے میں تین چوکیاں بنانے کی اجازت دی لیکن حسن خیل پھر بھی اپنی ضد پر قائم رہے۔[40] ۲۸ مارچ ۱۹۳۱ء میں چیف کمشنر نے مرکزی حکومت سے آشو خیل کی کالاخیل نامی شاخ پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی اور پھر فرنٹیئر کنسٹبلری نے باقاعدہ فورس کی مدد سے ۱۲ اپریل ۱۹۳۱ء کو اوچہ الگڈہ میں کالاخیل کی بستیوں پر حملہ کر کے انہیں معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔[41] ۱۹۲۴ء میں اوچہ الگڈہ کے کالاخیل ڈپٹی کمشنر پشاور اور ۱۹۲۵ء میں خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر نگرانی لائے گئے۔

باب پنجم

عجب خان اور مس ایلس کا اغوا

قبائل کی تاریخ اپنے دامن میں شجاعت اور بہادری کے ان گنت داستانیں سمیٹے ہوئے ہے اس سر زمین نے کئی ایسے جیالے سپوتوں کو جنم دیا ہے جنہوں نے بے مثال جرات اور زندہ جاوید کارناموں سے نہ صرف پٹھانوں کی روایتی بہادری کو دوام بخشا بلکہ عزم واستقلال اور شجاعت کی نئی تاریخ رقم کی ان عالی ہمت اور غیور ہستیوں میں عجب خان بھی شامل تھے جس نے اپنی عزت وقار کیلئے ایک ایسی طاقت سے ٹکرلی جس کی قوت وسطوت اور شان وشوکت کی دھاک ساری دنیا میں بندھی ہوئی تھی۔

عجب خان کی داستان عزم وہمت نہ صرف پٹھانوں کے حجروں میں موضوع سخن ہے بلکہ قومی شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی مورخوں نے بھی اس کے کردار کو سراہا ہے اسی سلسلہ میں آرتھر سوینسن رقمطراز ہیں "یہ واقعہ (مس ایلس کے اغوا) ہندوستان اور انگلستان کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا۔۔۔۔ دو عظیم عالمی جنگوں کے درمیان غالباً یہ سرحد کا سب سے مشہور واقعہ ہے[1]" اس تحریر سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عجب خان (آ) کی شہرت سرحد کے کوہساروں اور ہندوستان

(آ) ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق عجب خان کا قد پانچ فٹ چار انچ تھا اور مس ایلس کے اغوا کے وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی لیکن شہزادہ خان کے کہنے کے مطابق اس وقت عجب خان کی عمر ۴۰ اور ۴۵ سال کے درمیان تھی۔ اسی طرح خود شہزادہ خان کی عمر ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان تھی۔

کے وسیع وعریض میدانوں تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی بہادری کا شہرہ انگلستان کے شہروں اور ایوانوں میں بھی گونجنے لگا اور اس نے برطانیہ کی دنیائے صحافت اور سیاست میں بھی ایک ہیجان برپا کر دیا۔

عجب خان آفریدی درہ آدم خیل کے بوستی خیل کی یونس خیل شاخ سے تعلق رکھتا تھا اس کے والد کا نام غلام حیدر تھا جو کوتل پوسٹ کے دامن میں وادی بوستی خیل کے ملک کمال خان موسیٰ خیل کے گاؤں میں سکونت پذیر تھا[2]۔ عجب خان درمیانہ قد، گندمی رنگ اور خاموش طبع انسان تھا مگر دوسری طرف اس کا چھوٹا بھائی شہزادہ خان (آ) دراز قد اور وجیہہ نوجوان تھا۔

عجب خان کو قدرت نے چوڑا چکلا سینہ، شیر جیسا دل اور مضبوط بازو عطا کئے تھے بچپن ہی سے اسے بندوق سے محبت تھی اور سولہ سال کی عمر میں اسے قبیلہ بھر میں نشانہ بازی میں امتیازی حیثیت حاصل تھی اس وقت ہندوستان میں انگریز ہوس ملک گیری کے تحت قبائل کی آزادی سلب کرنے اور انہیں زیر کرنے کیلئے وقتاً فوقتاً جو اقدامات کر رہے تھے ان کو نہ صرف عجب خان بلکہ دیگر حریت پسند قبائل بھی تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انگریز دشمنی ان کے خون میں رچی بسی تھی لیکن ساتھ ہی وہ اس حقیقت سے بھی ناآشنا تھے کہ جدید اسلحہ کے بغیر انگریزوں سے نبرد آزمائی ناممکن ہے اسلئے

(آ) شہزادہ خان ۱۳۰ بلوچی رجمنٹ میں بطور سپاہی ملازم تھا پہلی جنگ عظیم کے دوران ۱۳۰ بلوچی رجمنٹ نے سات دوسری پلاٹونوں کے ساتھ رنگون میں لڑنے سے انکار کیا اس لئے ان پر فوجی بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور انہیں دس سے پندرہ سال قید کی سزائیں دی گیئں۔ جمعدار خوشحال خان مہمند اور حوالدار خوشحال خان آفریدی کو گولی سے اڑا دیا گیا جبکہ شہزادہ خان اور اس کے بعض ساتھیوں کو بکسر اور ہزاری باغ میں چار سال قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا کیا گیا۔

انہوں نے ہر ممکن طریقے سے اسلحہ کے حصول کیلئے دوڑ دھوپ شروع کی اور سرکاری چوکیوں اور اسلحہ کے گوداموں پر حملوں کے منصوبے بنائے۔ اس مہم کا آغاز کوہاٹ سے ہوا ایک دن عجب خان نے کوہاٹ میں پہرہ دینے والے سنتری پر حملہ کر کے اس سے بندوق چھینی[3] اور پل بھر میں دشمن کی نظروں سے غائب ہو گیا دن کی روشنی میں ایک فوجی سے بندوق کا چھین جانا غیر معمولی واقعہ تھا اسلئے ساری چھاؤنی میں ہلچل مچ گئی۔ فرنگی اس واقعے سے بوکھلا گیا اور عجب خان کی گرفتاری کیلئے سخت احکامات جاری کئے لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔

عجب خان کا دائرہ تعلقات افغانستان تک پھیلا ہوا تھا وہ افغانستان کے زازئی اور جدران قبائل سے اسلحہ کی تجارت کرتا تھا اور اسلئے اسے پہاڑی راستوں اور پگڈنڈیوں سے خوب واقفیت حاصل تھی۔ افغانستان کے تیسری جنگ کے موقع پر جب جنرل نادر خان نے ٹل پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے دشوار گزار پہاڑوں کے راستے ٹل تک پہنچنے کیلئے کسی رہبر کی ضرورت پیش آئی تو یہ فریضہ بھی عجب خان ہی نے انجام دیا اور افغان فوج کا ٹل پر حملہ کامیاب رہا۔ انہیں دنوں حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے کہ درہ آدم خیل، جواکی اور کزئی قبائل نے کوہاٹ چھاؤنی اور اس کے مضافات پر حملے شروع کر دیئے ان کو موضع سیاب، گنڈیالی، راز گیر بانڈہ، بابری بانڈہ غلام بانڈہ اور ضلع کوہاٹ کے شیخان، میر احمد خیل، جنگل خیل اور محمد زئی دیہات کے لوگوں کی مدد اور اعانت حاصل تھی۔ عجب خان اور اس کے ساتھیوں نے ۲۶ اور ۲۷ نومبر ۱۹۱۹ء کی درمیانی شب کو کوہاٹ میں ۱۳ لانسر کے گارڈ روم پر حملہ کیا جس میں ایک سنتری مارا گیا اور حملہ آور اپنے ساتھ ۱۲۵ بندوقیں، ۸ دوربین، ۱۵ تلواریں اور ۳۱۷ کارتوس لے گئے[4] اس حملے کا دعوی مرزا علی قمبر خیل اور اس کے دو ساتھیوں کے علاوہ زخاخیل، آکاخیل، تیراہ جواکی، جنگل خیل اور عجب خان پر کیا گیا۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو عجب خان کوہاٹ چھاؤنی سے دو گھوڑے اپنے ساتھ لے گیا جو اس نے ملا محمود اخونزادہ کو بطور تحفہ پیش کئے ان میں سے ایک گھوڑا کیپٹن سپارکس کا تھا جو بعد

میں ملا محمود اخونزادہ نے مس ایلس کو سواری کیلئے دیا تھا[5]۔ اسی سال نومبر کی ۱۴ اور ۱۵ تاریخ کی درمیانی شب عجب خان، شہزادہ خان اور ان کے ساتھیوں نے کوہاٹ چھاؤنی میں کرنل فوکس کے بنگلے پر ہلہ بول دیا۔ کرنل فوکس اس حملے میں مارا گیا اور اس کی بیوی زخموں کی تاب نہ لا کر اس واقعہ کے ۲۰ دن بعد ۶ دسمبر ۱۹۲۰ء کو انتقال کر گئی[6] اس حملے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شہزادہ خان نے ایک ملاقات میں بتایا کہ برصغیر جنوبی ایشیاء کے حریت پسندوں کو انگریزوں کی قید و بند سے چھڑانے کیلئے انہوں نے ایک انگریز اور اس کی بیوی کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو ناکام ہوا اور انگریز بمعہ بیوی کے مارا گیا۔ اسی طرح محمد گلاب ننگرہاری عجب خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ انگریز لڑکیوں کو اغوا کرنا چاہتا تھا تاکہ ان کے بدلے ہندوستان میں گرفتار کئے جانے والے تحریک آزادی کے چند سربر آوردہ محبوس افراد کو رہائی دلائی جاسکے[7]۔

عجب خان نے ۱۳ اور ۱۴ اپریل ۱۹۲۱ء کی درمیانی شب کو کوہاٹ کے فوجی ہسپتال میں ۵۶ رائفلز ایف۔ایف گارڈ پر حملہ کیا جس میں دو سپاہی ہلاک اور ایک شدید زخمی ہوا اور حملہ آوروں نے دو بندوقیں بھی قبضہ کر لیں[8] اس حملے کے بعد انگریزوں نے ہر مجرم عجب خان کے کھاتے میں لکھنا شروع کیا جس سے اسے مزید شہرت حاصل ہو گئی اس واقعہ کے چند روز بعد ایک جرگہ میں عجب خان کا سامنا کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کرنل بروس سے ہوا۔ ڈپٹی کمشنر نے عجب خان سے مخاطب ہوتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں کہا "تم ٹل پر حملہ میں ملوث تھے اور کوہاٹ چھاؤنی کو بھی تم نے لوٹا۔ میں تم سے نمٹ لونگا"۔ عجب خان کی غیرت کرنل بروس کی یہ گیدڑ بھبکی برداشت نہ کر سکی۔ اس نے پستول پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا "جب میری اور آپ کی صلح نہیں تو پھر دیکھ لیں گے"۔ اس دن سے عجب خان کی انگریز دشمنی مزید شدت اختیار کر گئی۔ شہزادہ خان کے مطابق کرنل بروس طاقت کے نشہ میں اتنا چور تھا کہ وہ برملا کہا کرتا تھا کہ اگر وہ بکری کے گلے میں سونے کا ہار ڈال کر اسے بیاباں میں کھلا چھوڑ دے

تو بھی وہ صحیح سالم واپس آجائیگی لیکن اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور جلد ہی اسے ہزیمت اٹھانی پڑی۔[9]

اب عجب خان نے ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ انگریزوں پر بھر پور وار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ۲۲ فروری ۱۹۲۳ء کو اس نے پولیس لائن کوہاٹ میں اسلحہ خانے کے ایک گودام پر حملہ کیا جس میں ۴۶ تھری ناٹ تھری بندوقیں اس کے ہاتھ آئیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت ایک ہزار روپے تھی۔[10] انگریزوں نے مخبروں کے ذریعے مسروقہ اسلحہ کا کھوج لگانا شروع کیا۔ موضع کاغذی ضلع کوہاٹ کے ایک مفرور نے جو ارتکاب جرم کے بعد سرہ میلہ کے غازی نامی شخص کے ہاں پناہ گزین تھا اس شرط پر کوہاٹ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اس واقعہ سے آگاہ کیا کہ اسے جرم سے نہ صرف بری الذمہ ٹھہرایا جائیگا بلکہ انعام بھی دیا جائیگا۔ اس مفرور کو عجب خان کے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ موخرالذکر نے مسروقہ بندوقیں ایک تہہ خانے میں چھپار کھی ہیں انگریز یہ جان کر بہت جزبز ہوئے اور انہوں نے قبائلی زعماء کو بلا کر انتقامی کاروائی کی دھمکیاں دیں مگر انگریزوں کی دھونس نہ چل سکی اور قبائلی زعماء نے بندوقوں کے سلسلہ میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا اس انکار پر انگریز مزید برہم ہوئے اور انہوں نے بندوقوں کی بازیابی اور عجب خان کی گرفتاری کیلئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے مقامی فوج کے بریگیڈ کمانڈر کی مدد سے عجب خان کے گھر پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ ۵ مارچ ۱۹۲۳ء کو فرنٹیئر کنسٹبلری نے ہینڈی سائڈ (آ) کے زیر کمان بوستی خیل میں عجب خان کے

(آ) ای۔ سی ہینڈی سائڈ صوبہ سرحد کے فرنٹیئر کنسٹیبلری کا کمانڈنٹ تھا۔ وہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۶ء کو متھرہ کے قریب کنڈر نامی جگہ میں تہکال کے نری اور اکبری نامی دو مفروروں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مارا گیا۔ کوتل پوسٹ پر جو یادگاری دروازہ تعمیر کیا گیا ہے وہ عجب خان کے گاؤں پر ہینڈی سائڈ کے حملے اور مفروروں کے ہاتھوں اس کی موت کی یاد دلاتا ہے۔

گاؤں پر اچانک حملہ کیا[11] علی الصبح بوستی خیل کا محاصرہ کر لیا۔ قبائلی روایات کے برعکس حملہ آور فوج نے چادر اور چار دیواری کی حرمت کا بھی لحاظ نہ رکھا اور لوٹ مار کے بعد ۳۳ بندوقیں بھی ساتھ لے گئے اس کے علاوہ وہ عجب خان کے چار ساتھیوں عالم خان، ملک کمال، شیر خان پنجابی اور اللہ یار خان سوماری کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ کوہاٹ لے گئے۔ اس موقع پر نہ تو عجب خان اور نہ اس کا بھائی شہزادہ خان ہی گھر میں موجود تھے۔ عجب خان شکار کھیلنے گیا ہوا تھا اور شہزادہ خان جلال آباد سے واپسی پر پشاور کے محلہ باجوڑی میں میاں تیفور گل کاکاخیل کے ہاں مقیم تھا جہاں اسے انگریزوں کے اس حملے کی اطلاع ملی۔[12]

گاؤں پہنچنے کے بعد جب عجب خان کو انگریزوں کی جارحیت، چادر اور چار دیواری کی بے حرمتی اور اپنے ساتھیوں کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ آگ بگولہ ہوا مارے غصے کے وہ ایک زخمی شیر کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کے آنکھوں میں خون اتر آیا اور گھر کی باعصمت خواتین کی توہین نے اسے انگاروں پر لیٹا دیا اسلئے اس نے ہر قیمت پر بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ ماں کی تلخ باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ انتقام کی غرض سے گھر سے چل پڑا۔ ٹوپئی کے جمشید نامی پشتو شاعر نے اپنی کتاب "عجب خان آفریدئے نر پختون" میں ماں اور بیٹے کے مکالمے کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔

راوی وائی عجب خان چہ راغے کور تہ — (راوی کے مطابق عجب خان جب گھر پہنچا)

پہ ادب سرہ سلام ئے او کڑو مور تہ — (ماں کے حضور اداب و تسلیمات بجالائے)

مور ئے وے چہ ځما د مخے نہ پناہ شہ — (ماں نے کہا کہ میری نظروں سے دفع ہو جاؤ)

نہ بے ننگہ ئے تورتخلے جوړ پہ تا شہ — (تم بے غیرت ہو تمہیں قبر میں دفن ہونا چاہیئے)

ځما سترگے دے ښکتہ پہ ټول قام کښی — (مجھے قبیلہ بھر کی نظروں سے گرادیا ہے)

ملامتہ یمہ ناستہ خاص و عام کښی — (میں ہر کسی کے سامنے شرمندہ ہوں)

فرنگیانو والہ واخستہ عزت (انگریزوں نے ہماری عزت پر وار کیا)
ذنانہ ئے کړے بے سترہ پہ ذلت (اور خواتین کی پردہ داری کا بھی خیال نہیں رکھا)
(ظالموں نے دوشیزاوں کے پردے کا بھی لحاظ نہیں رکھا) پیغلے جونہ بے پردے کړے ظالمانو
(اور جوانوں کی بندوقیں بھی ساتھ لے گئے) هم ئے یوړلے دفلے ڈخوانانو
پہ دبنتیا سرہ کہ ئے ځما فرزند (اگر واقعی تم میرے بیٹے ہو)
فرنګی نہ بدلہ آخلے سر کند (تو پھر انگریز سے علی الاعلان بدلہ لوگے)
(میرے بیٹے اگر تم نے بزدلی کا مظاہرہ کیا) نامردی کہ درنہ او شوہ ځما ځویہ
(تو پھر میں تیری موت پر آنسو نہیں بہاؤنگی) مستا پہ مرګ باندے بہ او بنکہ نہ کړم تو یہ
نہ بہ مخ درلہ او ګودم پہ کفن کښې (نہ تمہارے چہرے کو کفن میں دیکھنا گوارا کروں گی)
نہ بہ ښخلے درلہ پریږدم پہ وطن کښې اور نہ اپنے دیس میں تمہیں دفنانے دوں گی)
(پٹھان مائیں جب بہادر اولاد کو جنم دیتی ہیں) پښتنے میاندے چہ راوړی نر اولاد
(تو ان کی غیرت کی بدولت ان کے اباواجداد کا نام روشن ہو جاتا ہے) پہ غیرت ئے نوم دپلاد نیکہ شی بښاد

عجب خان نے اپنے اہل وعیال کو علاقہ ماموزئی (آ) بھیجا جہاں سلطان میر اور میرک نے انہیں رہائش کیلئے ایک مکان دیا اور خود انگریزوں پر وار کرنے کی غرض سے کوہاٹ چھاؤنی کے چکر کاٹنے لگا۔

۲۱ مارچ ۱۹۲۳ء کو عجب خان اور شہزادہ خان نے چھاؤنی میں رائل آرٹلری کے دو افسروں کو جو کمپنی باغ سے قلعہ بالاحصار کی طرف سائیکلوں پر جا رہے تھے للکارا لیکن وہ سائیکلیں چھوڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب[۱۳]

(آ) ماموزئی اور کنزئی تیراہ کا علاقہ ہے۔

ہو گئے۔ اس حملے کے بعد انگریز گھبرا گئے اور اپنی حفاظت کیلئے تمام ضروری تدابیر اختیار کیں۔ میک کوین لائن اور دیگر سڑکوں پر نوبتی چوکیدار متعین کئے گئے اور کوہاٹ چھاؤنی میں گشت کیلئے ہنگو سے ۳۰ جوانوں پر مشتمل ایک دستہ منگوایا گیا اس کے ساتھ ہی فوج کو چھاؤنی کی حدود میں گشت کرنے کا حکم دیا گیا[۱۴]۔ انگریزوں نے بوستی خیل اور شیرا کی قبائل کو تنبیہہ کی کہ اگر عجب خان نے دوبارہ سرکاری علاقے پر حملہ کیا تو ان کی ساری ذمہ داری ان کے سر ہو گی۔ دولت زئی (فیروز خیل، عثمان خیل اور بیزوٹی) کو بھی دھمکی دی کہ وہ عجب خان کے ساتھ تعاون سے گریز کریں۔

فوج کے دو افسروں پر ناکام حملے کے بعد عجب خان نے میجر ایلس کے اغوا کا منصوبہ بنایا میجر ایلس کا اغوا آگ سے کھیلنے کے مترادف تھا کیونکہ اس کا بنگلہ بریگیڈ کمانڈر کے فلیگ سٹاف ہاؤس کے بالکل قریب تھا جہاں دن رات پہرہ رہتا تھا۔ میجر ایلس کے بنگلے کے قریب ایک فوجی چوکی بھی تھی جہاں تیس (۳۰) افراد پر مشتمل ایک فوجی دستہ ہر وقت ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ میجر ایلس کے بنگلے کے ایک حصہ میں کیپٹن ہائی لینڈ بھی مقیم تھا اور گھر میں ایک کتے کے علاوہ چوکیدار بھی متعین تھا[۱۵] لیکن ان سب رکاوٹوں کے باوجود عجب خان مس ایلس کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

مس ایلس کے اغوا کے متعلق کئی روائتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق کتے کی موجودگی میں بنگلے میں داخل ہونا تو درکنار اس کے قریب آنا بھی مشکل تھا اسلئے عجب خان نے کتے کو اپنے آپ سے مانوس کرنے کیلئے اسے گوشت کھلانا شروع کیا (آ) اور جب اسے کتے کی طرف سے تسلی ہوئی تو پھر میجر ایلس کے بنگلے پر دھاوا بول دیا مگر یہ روایت صحیح دکھائی نہیں دیتی کیونکہ کتے کو مانوس

(آ) اللہ بخش یوسفی نے اپنی تصنیف "تاریخ آزاد پٹھان" جلد دوم میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

کرنے کیلئے کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عجب خان کی گرفتاری کیلئے اہم چوکیوں پر فوج اور پولیس تعینات تھی اور ایسے حفاظتی اقدامات کی موجودگی میں عجب خان کیلئے روزانہ کوہاٹ چھاؤنی کے چکر لگانا اس کے منصوبے کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ مس ایلس کے اغوا کی رات کیپٹن ہائی لینڈ چوکیدار کے شوروغل اور کتے کے بھونکنے پر جاگ گیا تھا اگر کتا عجب خان سے مانوس ہوتا تو پھر اس کے بھونکنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شہزادہ خان نے بھی اپنے انٹرویو میں اس روایت کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ دوسری روایت کے مطابق عجب خان روشندان (آ) کے ذریعے میجر ایلس کے بنگلے میں داخل ہوا تھا یہ روایت حقیقت پر مبنی دکھائی دیتی ہے اور مس ایلس اور شہزادہ خان نے اپنے انٹرویوز میں اس کی تصدیق کی ہے کہ عجب خان روشندان کے راستے مکان میں داخل ہوا۔

شہزادہ خان کے بیان کے مطابق عجب خان نے خواتین کی مبینہ بے عزتی کا بدلہ لینے کیلئے ایک فرنگی کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک رات کوہاٹ چھاؤنی میں سڑک پر ایک انگریز مرد اور عورت کو ٹہلتے دیکھ کر ان کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا کہ دوسری طرف سے ایک مسلح سنتری نمودار ہوا اور انہیں وقتی طور پر اغوا کا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے بیس (۲۰) دن بعد یعنی

(آ) مس ایلس نے روزنامہ مشرق پشاور (یکم مارچ ۸۳) کے ساتھ ایک ملاقات میں بتایا کہ اس نے رات کے بارہ بجے کے قریب ایک ہاتھ روشندان سے اندر کی طرف بڑھتے دیکھا۔

بیتے دنوں کی یادیں۔ ۱۹۸۳ میں پشاور آمد پر مس ایلس
اپنے اغوا کی یادیں تازہ کر رہی ہیں

پہلی غیر ملکی خاتون۔ مسز لیلن ۔اے۔ سٹار
جسے تیراہ جانے کا اعزاز حاصل ہوا

۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء کو عجب خان، شہزادہ خان، حیدر شاہ اور گل اکبر کی معیت میں کوہاٹ روانہ ہوا۔ (آ) دن کو وہ کوہاٹ کی ایک مضافاتی بستی شاہ پور میں ٹھہرے اور رات کو انہوں نے میجر ایلس کے بنگلے پر ہلہ بول دیا۔ عجب خان نے بنگلے میں داخل ہو کر اپنے ساتھیوں کیلئے بنگلے کے دروازے کھول دیئے۔ مس ایلس اسی رات ۸ بجے گھر واپس آئی تھی اور کھانا کھانے کے بعد ایک کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھی۔ سونے سے قبل اس نے خود ہی گھر کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے رات کے بارہ بجے جب سارا کوہاٹ سکون سے محو خواب تھا عجب خان میجر ایلس کے بنگلے میں داخل ہوا تو اس وقت مس ایلس اور اس کی ماں دو پیوستہ چارپائیوں میں مچھر دانی کے نیچے سو رہی تھیں۔ عجب خان اور اس کے ساتھی پہلے ایک خالی کمرے میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد عجب خان ہاتھ میں ٹارچ لئے مسز ایلس کے کمرے میں گیا لیکن مسز ایلس نے اسے دیکھتے ہی ٹارچ پر ہاتھ مارا اور ساتھ ہی سیٹھی بھی بجائی عجب خان کی خواہش تھی کہ اس حملہ میں میجر ایلس کے گھر کا کوئی فرد ہلاک یا زخمی نہ ہونے پائے لیکن مسز ایلس کے شور و غل کی وجہ سے ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا اور شہزادہ خان نے غلط فہمی کی بنا پر مسز ایلس پر خنجر کا وار

(آ) مفرور حیدر شاہ ضلع کیمبل پور کے جبئی شاہ ڈھیری، ڈاکخانہ مکھڈ کا رہنے والا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ سات انچ تھا اور اس کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی وہ پنجابی اور پشتو دونوں زبانیں بول سکتا تھا۔ شہزادہ کے کہنے کے مطابق حیدر شاہ اسی روز انہیں راستے میں اتفاقی طور پر ملا تھا اور وہ اس ڈر سے کہ کہیں حیدر شاہ ان کے منصوبے کا راز فاش نہ کرے حفظ ماتقدم کے طور پر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ بعد میں عجب خان نے اپنی لڑکی کی شادی حیدر شاہ سے کرادی۔

کر کے اسے موت کی نیند سلادیا چونکہ مسز ایلس نے ایک مرد کی طرح مزاحمت کی تھی اسلئے شہزادہ خان نے رات کی تاریکی میں اسے میجر ایلس خیال کرتے ہوئے اس پر خنجر کے پے در پے کئی وار کئے۔ شہزادہ خان پر یہ حقیقت کہ اس نے مرد کی بجائے عورت کو قتل کیا ہے اس وقت عیاں ہوئی جب مسز ایلس کے سر کے بال اس کے بازؤں پر آ گرے۔[18]

اس خونین ڈرامے کے بعد عجب خان مس ایلس کو بنگلے کی پشت پر درختوں کے جھنڈ میں ہاکی گراؤنڈ کے بائیں طرف لے گیا اور انرسر کولر روڈ کے راستے ریلوے سٹیشن کے قریب نکل آیا۔ اس نے ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ خوشحال گڑھ کی راہ لی اور طلوع افتاب سے قبل گاؤں شیخان کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ جب چوکیدار نے جاگنے کے بعد شور وغل مچانا شروع کیا تو کیپٹن ہائی لینڈ بھی اس کے شور اور کتے کے بھونکنے پر جاگ اٹھا اس نے سب سے پہلے مسز ایلس کے نوکر کو تین دفعہ سیٹی بجانے کا حکم دیا کیونکہ آفیسر کمانڈنگ نے مسز ایلس کو ضرورت کے وقت تین دفعہ سیٹی بجانے کی تاکید کی تھی اس کے بعد مسز ایلس کا خانساماں ہاتھ میں لالٹین لئے جی۔او۔سی کے بنگلے پر پہرہ دینے والے سپاہیوں کے پاس گیا اور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر میجر ایلس کے بنگلے پر واپس آیا۔[19] سپاہیوں کی آمد سے خوف سے سہمے ہوئے کیپٹن ہائی لینڈ کی کچھ ہمت بندھی اور وہ قدرے توقف کے بعد مسز ایلس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے قریبی فوجی چوکی کے انچارج کیپٹن بوئیسٹ، پولیس اور فرنٹیئر کنسٹبلری کے سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر کو ٹیلیفون پر اس واقعہ کی اطلاع دی اور کوتل اور درہ اوبلان کے دہانے پر واقع ایف سی پوسٹ کو مطلع کیا۔ فرنٹیئر کنسٹبلری کے کمانڈنٹ ہینڈی سائڈ کو بھی اس دلیرانہ واردات کی اطلاع دی گئی۔ فوج اور پولیس کو عجب خان کا تعاقب کرنے اور فرار کے سارے راستے مسدود کرنے کے احکامات جاری کردیئے گئے۔ درہ آدم خیل جانے والے راستوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے مگر عجب خان نے ان تمام حفاظتی اقدامات سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر کامیابی کے

ساتھ جاری رکھا۔

ڈپٹی کمشنر کوہاٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد ۱۶ انفنٹری بریگیڈ کے کمانڈر کرنل بیڈی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے فوراً رسالے کو حکم دیا کہ محمد زئی اور آبازئی کے راستوں کو مسدود کر کے وہاں سفر کرنے والے لوگوں کو روکا جائے۔ توپ خانے کے ایک کمپنی نے موضع محمد زئی کا محاصرہ کیا اور ڈپٹی کمشنر نے شہر کے فصیل کی تمام دروازوں کو بند کرنے اور کوہاٹ شہر میں موجود قبائل کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کئے پولیس کو ہدایت کی گئی کہ قبائل کو تا حکم ثانی حراست میں رکھا جائے اس کے علاوہ خفیہ پارٹیوں کو ترتیب دے کر انہیں شہر کے مضافات میں پھیلا دیا گیا۔[20] ڈپٹی کمشنر نے ہنگو کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ایچی سن کو بھی مس ایلس کے اغوا کی اطلاع دی اور اسے ہدایت کی کہ اور کزئی قبائل اور خاص طور سے علی خیل، ماموزئی اور مشتی قبائل کو تنبیہ کی جائے کہ نہ عجب خان کو پناہ دیں اور نہ اسے اپنے علاقے میں سے گزرنے کی اجازت دیں۔ ان قبائل کو یہ لالچ بھی دیا گیا کہ اگر کسی نے مس ایلس کو عجب خان کی گرفت سے چھڑانے میں حکومت کی مدد کی تو اسے انعام و اکرام سے نوازا جائیگا۔ ہنگو کے اسسٹنٹ کمشنر نے یہ اطلاع پاتے ہی فرنٹیئر کنسٹبلری کے ڈسٹرکٹ آفیسر ڈوھیوم کو عجب خان کا تعاقب کرنے کی ہدایت کی مگر وہ رات بھر گشت کرنے کے بعد ناکام لوٹا۔

۱۴ اپریل ۱۹۲۳ء کو ہینڈی سائیڈ فرنٹیئر کنسٹبلری کے ۲۵۰ جوانوں پر مشتمل ایک دستے کے ہمراہ پشاور سے کوہاٹ پہنچا اور ان کو مختلف اطراف میں پھیلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ۵۹ سندھ رائفلز اور فرنٹیئر کنسٹبلری کے جوانوں نے بھی ابراہیم زئی سے کوہاٹ اور بوراکہ تک کا سارا علاقہ چھان مارا مگر کوشش بسیار کے باوجود بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔[21] ڈپٹی کمشنر کوہاٹ نے صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر جان میفے کو مس ایلس کے اغوا کی اطلاع دی اور اسے مطلع کیا کہ تاحال اس کا اتہ پتہ نہیں مل

سکا۔ چیف کمشنر کیلئے یہ خبر آسمانی بجلی سے کم نہ تھی وہ اپنا دورہ مختصر کرکے بنوں سے کوہاٹ پہنچا
جہاں اس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے بعد مس ایلس کی بازیابی کیلئے ضروری احکامات جاری کئے
ایک طرف حکومت کی ساری مشینری عجب خان کے خلاف حرکت میں آچکی تھی اور دوسری
طرف عجب خان شیراکی کے نزدیک سنڈہ بستہ تالاب کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر ایک محفوظ مقام پر جا پہنچا
تھا جہاں سے مس ایلس ان فوجی جوانوں کی نقل و حمل کا نظارہ کر سکتی تھی جو اس کی تلاش میں مارے
مارے پھر رہے تھے لیکن کسی کو مدد کیلئے پکارنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ۱۴ اپریل کا پورا دن انہوں
نے پہاڑ پر قیام کیا۔[۲۲] شہزادہ خان کے کہنے کے مطابق مس ایلس نے اس کو اردو زبان میں کہا "پیسے
کیلئے لے جاتے ہو" اور پھر قلم اور کاغذ مانگا اس سے جب قلم اور کاغذ مانگنے کی وجہ دریافت کی گئی تو
کہنے لگی کہ "تم لوگوں کیلئے روپے منگواتی ہوں" لیکن شہزادہ خان نے ازراہ مذاق کہا کہ کیا ایسا ممکن نہیں
کہ آپ ہمیں بروس کے بنگلے کا پتہ بتادیں "ہم مسز بروس کو اغوا کرنے کے بعد آپ کو رہا کردیں گے"۔
یہ سنتے ہی مس ایلس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ اچھا تم لوگ مجھے روپوں کیلئے نہیں بلکہ مارنے کیلئے
لے جا رہے ہو مگر عجب خان نے اسے تسلی دی اور اسے حفاظت کا پورا پورا یقین دلایا۔[۲۳] غروب آفتاب سے
کچھ دیر قبل عجب خان نے دوربین کے ذریعے اردگرد علاقے کا بغور جائزہ لیا اور پھر شام کو وہ سنڈہ بستہ
تالاب کے قریب سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔ شہزادہ خان ان سے آدھ گھنٹہ قبل ایک قریبی گاؤں
میں جا چکا تھا۔ واپسی پر کاونٹر خان شیراکی کے گاؤں سے مس ایلس کیلئے گرم موزے، گرم دودھ اور
روٹی لیتا ہوا سنڈہ بستہ کے قریب عجب خان سے آملا۔[۲۴] یہاں سے یہ چھوٹا سا قافلہ زوڑ کلی کے قریب
سردار خیل پہنچا جہاں انہوں نے مس ایلس کی سواری کیلئے ایک گدھے کا انتظام کیا۔ سنی خیل کے
سرمست نامی شخص کے گاؤں میں مختصر قیام کے دوران انہوں نے اپنے لئے انڈے، دودھ، آٹے، چینی
اور آلو وغیرہ کا بندوبست کیا۔ بلندر پہاڑ کے دامن میں انہوں نے گدھے کو چھوڑ دیا اور ۱۵ تاریخ کی صبح

براستہ بلندر (آ) شہباز نیکہ پہنچے اور خاونلئی کنڈاؤ میں ایک محفوظ مقام پر قیام کیا۔
عجب خان اور اس کے ساتھی رات کو اپنا سفر جاری رکھتے اور دن کو کسی محفوظ مقام پر قیام
کرتے۔ احتیاطاً وہ سب ایک ہی جگہ نہیں سوتے تھے بلکہ حیدر شاہ اور گل اکبر ایک جگہ اور مس ایلس اور
شہزادہ خان ان سے چند گز دور سوتے تھے۔ ۱۵ تاریخ کو بعد از دوپہر اس چھوٹے سے قافلے نے خاونلئی
کنڈاؤ سے برکی نیکہ کی طرف سفر شروع کیا۔ یہاں مس ایلس نے پہلی بار ایک دریائی نالے سے پانی پیا۔
۱۶ تاریخ کی صبح کو وہ منزہ خیئ پہاڑ کی ایک گھاٹی میں ٹھہرے۔ اسی روز شام کے وقت انہوں نے اپنا
سفر دوبارہ شروع کیا وہ تمام رات وادی مستورہ میں سفر کرتے رہے اور ۱۸ تاریخ کو تیراہ میں عجب خان کے
گھر پہنچ گئے جہاں انہوں نے تین روز تک قیام کیا۔
مس ایلس کے اغوا نے حکومت برطانیہ کے قصر غرور کو ہلا کر رکھ دیا۔ خیبر سے لندن تک
تہلکہ سا مچ گیا اور انگریزوں کو سرحد میں پہلی بار ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی نیندیں حرام
کردی تھیں۔ یہاں ایک جوان انگریز لڑکی کی عزت و ناموس (ب) اور زندگی کا سوال تھا اسلئے ان پر نزع کا

(آ) بلندر ایک پہاڑ کا نام ہے جس کو سنی خیل اور بوستی خیل کی طرف سے راستے جاتے ہیں۔ یہ پہاڑ گھنے جنگلات اور ہرنوں کے شکار کیلئے مشہور ہے۔ شہباز نیکہ بلندر کے پہاڑ پر ایک بزرگ کا مزار ہے۔

(ب) افغانستان کے "امان افغان" نامی اخبار نے مس ایلس کے اغوا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ "اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جس کا سبب وہ جذبہ انتقام ہے جو افغان قوم کے قومی ناموس کی بے حرمتی پر پیدا ہوا۔ اسی طرح یو۔پی کے الجلیل (بجنور) نامی اخبار نے لکھا کہ "مس ایلس کا بھگا لے جانا ایک افغانی کی توہین ناموس کا انتقام تھا"۔

عالم طاری تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۲۳ء تک مس ایلس کا کچھ پتہ نہ چلا ہر روز نت نئی افواہیں پھیلتی رہیں ان میں یہ سچی خبر بھی شامل تھی کہ مس ایلس تیراہ پہنچائی گئی ہے مگر تیراہ پہنچنا انگریزوں کیلئے مشکل تھا۔ ۱۸۹۷ء کی جنگ تیراہ کی تلخ یادیں ان کے ذہن پر ثبت تھیں وہ تیراہ کے غیور عوام کے جذبہ حریت اور دلیرانہ مزاحمت سے بخوبی واقف تھے اسلئے ان کے ساتھ دو، دو ہاتھ کرنے سے کتراتے تھے انہیں یہ بھی علم تھا کہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۹۷ء کی جنگ میں ان کی ۴۴ ہزار مسلح اور منظم فوج تیراہ کے غیور آفریدیوں کو مرعوب کر سکی اور نہ وہ اس سے کوئی مالی یا سیاسی فائدہ ہی حاصل کر سکے اس کے برعکس اس مہم پر بے دریغ رقم خرچ کرنے کے علاوہ ان کے ۱۱۵۰ افسر اور سپاہی آفریدیوں کے ہاتھوں ہلاک اور زخمی ہوئے تھے اسلئے انہوں نے مصالحانہ روش اختیار کرنے میں بہتری سمجھی لہذا قبائلی جرگے بلائے گئے اور مس ایلس کی بازیابی کیلئے قبائلی زعماء سے تعاون کی اپیلیں کی گئیں۔

صوبہ سرحد کے چیف کمشنر نے مس ایلس کی رہائی کے سلسلہ میں خان بہادر مغل باز خان (آ)،

(آ) خان بہادر مغل باز خان کے والد کا نام ترا باز تھا جو آفریدی قبیلہ کے کوکی خیل شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ انہوں نے ۲۵ جون ۱۸۹۶ء میں گائیڈ پلٹن میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۹۷ء میں ملاکنڈ، چکدرہ اور لنڈی کوتل کے معرکوں میں شجاعت اور بہادری کے دو تمغے حاصل کئے۔

۱۹۰۸ء میں زخاخیل کے خلاف لڑائی میں انہیں بہادری کا ایک تمغہ دیا گیا۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں رسالدار کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ نومبر ۱۹۱۱ء میں وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز کئے گئے نومبر ۱۹۱۸ء سے اپریل ۱۹۲۲ء تک ملاکنڈ ایجنسی میں اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۱۹ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب عطا کیا گیا۔

خان بہادر قلی خان، خان بہادر زمان خان درہ آدم خیل کے سرکردہ ملکوں اور سفید ریشوں اور مشن ہسپتال پشاور کی ایک نرس مسز بیلین اے۔ سٹار کی خدمات حاصل کیں۔ حکومت نے ۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء کو صوبیدار میجر عظیم اللہ خان کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے مس ایلس کو اپنی حفاظت میں لے لیں عظیم اللہ نے اس مقصد کیلئے اپنے لڑکے کو ماموزئی سے تیراہ بھیجا۔ ۱۷ تاریخ کو پولیس کے انسپکٹر سید اکبر خان مس ایلس کی مدد کیلئے نریاب سے روانہ ہوا اور ۱۷ تاریخ کو خوانین بنگش کے ایک جرگے نے اسی سلسلہ میں ملا محمود اخونزادہ سے ملاقات کی۔ ۱۸ تاریخ کو آدم خیل کا ایک جرگہ تیراہ کی طرف روانہ ہوا۔

۱۹ تاریخ کو خان بہادر قلی خان (آ) بھی کرم ایجنسی سے تیراہ روانہ ہوئے[۲۵]

ہنگو کے خوانین کا جو جرگہ ملا محمود اخونزادہ سے ملنے گیا تھا وہ ناکام لوٹا البتہ ۲۹ قبائلی زعماء پر مشتمل آدم خیل (گلی اور جواکی آفریدیوں) کے (ب) جرگے کو اپنے مقصد میں کچھ کامیابی حاصل ہوگئی[۲۶]

(آ) خان بہادر قلی خان نے دسمبر ۱۸۹۷ء میں بارڈر ملٹری پولیس میں بطور کلرک ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۰۱ء میں انہیں ہیڈ کلرک کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اسی سال وہ نائب تحصیلدار مقرر کئے گئے اور ۱۹۱۰ء میں تحصیلدار بنائے گئے۔ یکم جنوری ۱۹۱۳ء کو انہیں خان صاحب اور یکم جنوری ۱۹۱۹ء کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء کو وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر متمکن ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں وہ عارضی طور پر کرم ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ بنائے گئے۔

(ب) آدم خیل جرگہ میں جمعدار سرمست خان، ملک حیات خان، ملک عبدالخالق، ملک نور غلام، ملک سیدان شاہ، رسالدار میجر نور شیر، ملک امیر خان، ملک شیر دل خان، صوبیدار سید اللہ، صوبیدار نور شاہ، ملک سبز علی، ملک رضا خان، ملک تور خان، ملک رحمت خان، ملک نادر علی، ملک امین اللہ، ملک غلام حبیب، صوبیدار میجر سلطان میر، ملک عزیز اللہ، ملک جمعہ خان، ملک نواز خان، آخور کے ملک مثال خان، اشرف خان، گل بت خان، غفار خان، شربت خان، میر عالم خان، نجاب گل اور ملک باز گل شامل تھے۔

اس جرگے نے ۱۹ تاریخ کو ملا محمود سے بات چیت کی اور بعد میں انہوں نے عجب خان اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی۔ شروع میں عجب خان نے مس ایلس کے اغوا سے صاف انکار کیا لیکن بعد میں اس نے تسلیم کرلیا۔ اسی اثنا میں عجب خان اور سلطان میر کے درمیان جرگہ کے سوال پر اختلافات پیدا ہوگئے۔ عجب خان کی خواہش تھی کہ مس ایلس کی قسمت کا فیصلہ اخونزادہ صاحب کی وساطت سے کیا جائے۔ جبکہ سلطان میر خان، بہادر زمان خان کے ہاتھوں یہ فیصلہ کروانے پر مصر تھا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد عجب خان نے آدم خیل جرگہ کو مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں۔[۲۷]

(۱) بوستی خیل پر حملے کے دوران جو افراد حراست میں لئے گئے ان کو رہا کیا جائے۔

(۲) عجب خان کو اپنے علاقہ میں حسب سابق رہنے کی اجازت دی جائے۔

(۳) عجب خان کو جو نقصان اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

آدم خیل جرگہ کے ساتھ بات چیت جاری تھی کہ انسپکٹر سید اکبر خان، سب انسپکٹر راجہ ولی محمد خان اور صوبیدار بدیع الزمان اور ان کے بعد ۶ بجے شام خان بہادر قلی خان بھی وہاں پہنچ گئے اور ملا محمود اخونزادہ سے طویل ملاقات کی۔ ۱۹ اپریل کو چیف کمشنر نے مسز سٹار (آ) کو تیراہ بھیجنے کا فیصلہ کیا اور

(آ) مسز لیلین۔ اے سٹار نے نومبر ۱۹۱۳ء میں پشاور کے مشن ہسپتال میں بطور نرس کام شروع کیا۔ ۱ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں اسی ہسپتال کے ایک ڈاکٹر ورنن ہیرلڈ سے شادی کی اور ۱۷ مارچ ۱۹۱۷ء کو اس کا شوہر ایک آفریدی کے ہاتھوں مارا گیا اس آفریدی کو یہ شکایت تھی کہ مذکورہ ڈاکٹر نے اس کے جوان لڑکے کو عیسائی بننے کی ترغیب دی تھی۔ مسز سٹار ایک آفریدی کے ہاتھوں اپنے شوہر کے قتل کے بعد ۱۹۱۹ء میں پہلے مصر اور بعد میں لندن گئی۔ ایک سال بعد وہ پشاور لوٹ آئی اور ۱۹۲۰ء میں اس نے دوبارہ مشن ہسپتال میں ملازمت اختیار کی۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں جب مس ایلس کو اغوا کیا گیا تو صوبہ سرحد کے چیف کمشنر نے اسے تیراہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ تیراہ میں تین دن قیام کیا اور واپسی پر ٹیلز آف تیراہ اینڈ تبت نامی کتاب لکھی جس میں ایلس کے اغوا اور بازیابی کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۲۰ اپریل کو وہ خان بہادر مغل باز خان اور ملا کربوغہ کے فرزند صاحبزادہ عبدالحق اور ایک قبائلی حفاظتی دستے (بدرگہ) کی معیت میں تیراہ کی جانب روانہ ہوئے۔ چیف کمشنر ان کے ساتھ شنہ وڑئی تک گئے اور ضروری ہدایات دینے کے بعد ان کو خانکی کی طرف رخصت کیا چونکہ مسز سٹار نرسوں کے لباس میں تھی اسلئے خان بہادر مغل باز خان نے اسے ٹوپی کے اوپر پگڑی باندھنے کی ہدایت کی۔[۲۸] خانکی بازار جاتے وقت انہیں آخیل، علی شیرزئی، خادیزئی اور ماموزئی کے علاقے سے گزرنا تھا اسلئے خان بہادر مغل باز خان اور ان کے ساتھیوں کو جگہ، جگہ ٹھہرنا پڑا اور ان علاقوں کے قبائلی زعماء سے جرگے کرنے پڑے۔ رات بسر کرنے کیلئے وہ نعمت کلی میں ٹھہرے اور پھر صبح سات بجے خانکی کی جانب روانہ ہوئے۔ مسز سٹار اس سفر کے متعلق لکھتی ہیں "سفر کے دوران ہمیں جگہ جگہ ٹھہرنا پڑا کیونکہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں داخل ہونے کیلئے جرگوں کی ضرورت پیش آتی تھی"۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ "ملا کربوغہ کے فرزند کی موجودگی نے ان کے اس سفر کو بہت حد تک سہل اور آسان بنایا تھا"۔ تیراہ کے مذہبی اور روحانی پیشوا ملا محمود اخونزادہ کو جب یہ پتہ چلا کہ صاحبزادہ عبدالحق ایک انگریز عورت کی معیت میں تیراہ آرہا ہے تو انہوں نے اس کے نام اپنے خط میں ان کی آمد پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا اس موقع پر کرم ایجنسی کے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ خان بہادر قلی خان بھی تیراہ پہنچ گئے اور انہوں نے صوبیدار میجر عظیم اللہ کی مدد سے ۲۱ اپریل کو پہلے محمود اخونزادہ اور بعد میں عجب خان سے ملاقات کی۔ اس کے بعد خان بہادر مغل باز خان بھی مذاکرات میں شریک ہوگئے۔

۲۱ اپریل کو مس ایلس کی طرف سے کرم ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کو ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ "وہ میری رہائی کے بدلے روپوں اور اپنے تین ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہیں۔"[۲۹] ۲۱-۲۲ تاریخ کو مسز سٹار کو مس ایلس سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ اسی دوران خان بہادر زمان خان نے عجب خان کے گاؤں پر لشکر کشی کی۔ یہ خبر سنتے ہی شہزادہ خان نے ہنگامہ برپا کر دیا اور مسز سٹار

کو مس ایلس کے کمرے سے نکال دیا لیکن اخونزادہ صاحب نے شہزادہ خان کو مسز سٹار کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔ مسز سٹار اس واقعہ کے متعلق لکھتی ہیں کہ "شہزادہ خان بظاہر اس گروہ کا سرغنہ تھا"۔ شہزادہ خان نے اسے کمرے سے نکالتے ہوئے کہا "مس ایلس کو تمھاری کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تندرست ہے۔ بیمار نہیں"۔ مسز سٹار آگے لکھتی ہیں کہ شہزادہ خان کے غیظ وغضب کی وجہ اسے اس وقت معلوم ہوئی جب اسے یہ بتایا گیا کہ "خیبر کے آفریدیوں نے زمان خان کی سرکردگی میں سلطان میر اور عجب خان کے گھروں کو مسمار کرنے کیلئے لشکر کشی کی ہے" لیکن خان بہادر مغل باز خان نے تیراہ کے نواب خان بہادر زمان خان کو ہدایت کی کہ عجب خان کے خلاف اس وقت تک کوئی کاروائی نہ کی جائے جب تک مس ایلس بخریت وہاں سے نہ نکل جائے اس کے بعد خان بہادر قلی خان اور خان بہادر مغل باز خان نے عجب خان کے ساتھ پھر جرگہ کیا لیکن عجب خان اسی بات پر اڑا رہا کہ جب تک حکومت اس کی شرائط تسلیم نہیں کرتی مس ایلس کو رہا نہیں کیا جائیگا۔

عجب خان کی پہلی شرط یہ تھی کہ اسے پچاس ہزار روپے بطور ہرجانہ ادا کئے جائیں۔ دوسری یہ کہ بوستی خیل پر حملے کے دوران جو افراد حراست میں لئے گئے تھے ان کو رہا کیا جائے۔ تیسری یہ کہ کرنل فوکس اور اس کی بیوی کے قتل کا دعوی جن اشخاص پر کیا گیا ہے انہیں معاف کیا جائے لیکن اخونزادہ صاحب کی ترغیب پر عجب خان نے اپنی شرائط میں کچھ لچک پیدا کر دی اور زیادہ زور اپنے ساتھیوں کی رہائی پر دیا[۳۰] انگریزوں نے عجب خان کی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں ملا محمود اخونزادہ کے ہاتھ ہرجانہ ادا کیا اور اس کے دو ساتھیوں عالم خان اور کمال خان کو رہا کر دیا[۳۱] اس کے علاوہ خان بہادر مغل باز خان اور خان بہادر قلی خان نے اخونزادہ صاحب کو تحریری طور پر ضمانت دی کہ عجب خان کے ساتھی رہا کر دیئے جائیں گے اور قبائل پر علاقائی ذمہ داری کے تحت کوئی جرمانہ عائد نہیں کیا جائیگا اس کے بعد عجب خان نے مس ایلس کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ شہزادہ خان کے مطابق مس

ایلس نے اس سے (شہزادہ خان) شادی کا وعدہ کیا تھا اور تحریری طور پر اس خواہش کا اظہار کیا تھا مگر مس ایلس کی رہائی کے وقت اسے کسی ضروری کام کے بہانے اس کے گھر بھیج دیا گیا جو ملا اخونزادہ کے گھر سے تقریباً ۸ میل دور تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں مس ایلس کو ایک گھوڑے پر بٹھا کر روانہ کر دیا گیا یہ گھوڑا کیپٹن سپارکس کا تھا جو عجب خان نے محمود اخونزادہ کو تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ اخونزادہ صاحب نے اس موقع پر مس ایلس کو ایک طلائی ہار پیش کیا۔[۳۲]

مس ایلس نے رہائی کے بعد عجب خان کی سیرت، اخلاق اور حسن سلوک کی بہت تعریف کی اور اس بات کی تصدیق کی کہ عجب خان نے "اسے نگاہ بد سے نہیں دیکھا"۔ فروری ۱۹۸۳ء میں جب مس ایلس مسز مالی ویڈ کی حیثیت سے ۶۰ سال بعد پشاور آئی تو اس نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگرچہ اس کا اغوا اور اس کی والدہ کا قتل ایک ناخوشگوار اور المناک واقعہ تھا لیکن وہ عجب خان کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوئی تھی جنہوں نے قید کے اذیت ناک ایام میں اس کا ہر طرح خیال رکھا تھا۔ اسی طرح مسز سٹار نے اپنی طبی رپورٹ میں یہ حقیقت تسلیم کی کہ "نہ تو مس ایلس کو کسی قسم کی اذیت دی گئی اور نہ اس پر مجرمانہ حملہ کیا گیا[۳۳]" مسز سٹار کی یہ رپورٹ اور مس ایلس کا بیان عجب خان کی اعلی سیرت اور بلند کرداری کا ثبوت ہے جس پر پٹھان اپنا سر فخر سے اونچا رکھ سکتے ہیں۔

۲۲ اپریل ۱۹۲۳ء کو مس ایلس مسز سٹار، خان بہادر مغل باز خان اور خان بہادر قلی خان کی معیت میں تیراہ سے روانہ ہوئی اور رات کے ساڑھے آٹھ بجے شنواڑی پہنچی جہاں اس کے والد میجر ایلس، صوبہ سرحد کے چیف کمشنر سر جان میفے، کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کرنل بروس اور فرنٹیئر کنسٹبلری کے ڈسٹرکٹ آفیسر نے اس کا استقبال کیا۔ تیراہ سے مس ایلس کی واپسی پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ وائسرائے ہند نے تار کے ذریعے مس ایلس کی واپسی پر خوشی کا اظہار کیا اور مسز سٹار کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کی۔ اسی طرح شہنشاہ انگلستان مس ایلس کی واپسی پر اتنے خوش ہوئے کہ مسز سٹار کو قیصر

ہند کا طلائی تمغہ عطا کیا اس کے علاوہ ان سب افراد کو انعام و اکرام سے نواز گیا جنہوں نے مس ایلس کی رہائی میں حکومت سے تعاون کیا تھا۔[34]

تیراہ سے مس ایلس کی واپسی کے بعد عجب خان کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو خان بہادر زمان خان نے عجب خان اور سلطان میر کے گھروں کو مسمار کیا۔[35] عجب خان کے بیوی بچوں نے ماموزئی میں ملنگی نامی شخص کے گھر میں پناہ لی اور اخونزادہ صاحب نے علی شیر زئی کی غونزہ نامی جگہ میں انکی رہائش کا انتظام کیا اس کے ساتھ ہی انہوں نے عجب خان اور سلطان میر کے گھروں کو جلانے پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے خان بہادر زمان خان کو ہدایت کی کہ وہ عجب خان کی مخالفت سے باز آجائیں کیونکہ مس ایلس کی واپسی اسی شرط پر عمل میں لائی گئی تھی کہ قبیلے کے لوگوں کو کچھ نہیں کہا جائیگا۔[36] اپریل ۱۹۲۳ء کے اواخر تک انگریزوں نے خاموشی اختیار رکھی مگر عجب خان کی دیدہ دلیری سے انکے اوسان یوں خطا ہوئے تھے کہ وہ تیراہ میں بھی عجب خان کی موجودگی اپنے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ عجب خان انگریزوں کیلئے ایک ہوا بن چکا تھا اور قصہ خوانی بازار میں شب و روز ایسی افواہیں گشت کرتی تھیں کہ اس دفعہ عجب خان ایک بڑے انگریز افسر کو اغوا کرے گا۔[37] عجب خان کے دوسرے وار سے بچنے کیلئے انگریزوں نے اس سے مستقل چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ جنگی جنون نئے سرے سے ان کے ذہن میں ابھر آیا اور انہوں نے قبائل سے پر زور مطالبہ کیا کہ عجب خان کو ان کے حوالے کر دیا جائے یہ مطالبہ قبائل نے یکسر مسترد کر دیا۔

عجب خان کے گھر کو مسمار کرنے کے بعد چیف کمشنر نے کرم ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کو ہدایت کی کہ خوست کی طرف سے تمام راستے بند کر دیئے جائیں تاکہ عجب خان وہاں نہ جاسکے اس کے علاوہ حکومت نے علی شیر زئی قبائل کو عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو پکڑنے یا قتل کرنے کیلئے ایک لاکھ روپے کا انعام مقرر کیا[38] لیکن انہوں نے انگریزوں کی اس پیشکش کو حقارت سے ٹھکرایا۔ حکومت

نے اس پر سخت برہمی کا اظہار کیا کہ علی شیر زئی قبائل نے عجب خان کو پناہ کیوں دی تھی لیکن انہوں نے واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کی کہ ان پر اپنے علاقے میں کسی کو پناہ دینے پر کوئی پابندی نہیں[39] مختصر یہ کہ انگریزوں نے عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو تیراہ سے نکالنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر کے غصے کا یہ عالم تھا کہ اس نے ہند کے خارجہ امور کے سکرٹری ڈینس برے سے تیراہ پر بمباری کرنے کی اجازت طلب کی اور اپنے خط میں لکھا "میں کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے دیہات کو نشانہ بناؤں یہ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔۔۔۔۔ میں مجرموں پر ہوائی جہازوں کے ذریعے بم برسانے کی اجازت چاہتا ہوں اور ایسی کارروائی اس قسم کے کاروبار کا قلع قمع کر دے گی میں یہ اجازت فوری طور پر چاہتا ہوں تاکہ مختصر نوٹس پر ہوائی جہازوں کو استعمال کر سکوں۔ ہماری تمام تر توجہ مجرموں کے دیہات تک محدود رہے گی اور اگر اتفاقی طور پر تیراہ کے جو کی قبائل ایک آدھ بم کی زد میں آجائیں تو یہ ان کیلئے زیادہ نقصان دہ ثابت نہیں ہوگا کیونکہ کرنل فوکس کے قتل میں انہوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا اور اس جرم میں بھی یہ برابر کے شریک ہیں۔۔۔۔ کوہاٹ کے حادثے کے ملزموں کو سزا دینے کیلئے ائیر فورس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں۔ کوہاٹ کے جنگلات شر پسندوں کو پناہ کی دعوت دیتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ قبائل پر بم برسائے جائیں اس طرح کوہاٹ کی حفاظت دوچند ہو جائیگی۔[40]"

مرکزی حکومت نے اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا البتہ اس شرط پر تیراہ پر ہوائی جہازوں کی پرواز کی اجازت دے دی کہ وہاں وہ بمباری نہیں کریں گے۔ قبائلی زعماء نے مس ایلس کی بازیابی کے سلسلہ میں جو دوڑ دھوپ کی تھی اس کو سراہنے کی بجائے انگریز طاقت کا مظاہرہ کرنے پر اتر آئے۔ ۸ مئی ۱۹۲۳ء کو ۱۴ ہوائی جہازوں نے خانکی بازار پر پرواز کی۔ شہزادہ خان کے مطابق یہ ہوائی جہاز اتنی نیچی پرواز کر رہے تھے کہ ان کے پائلٹ صاف نظر آتے تھے اس ہوائی مظاہرے کے نتیجہ میں ملا محمود اخونزادہ نے بھی عجب خان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شہزادہ خان کے مطابق اخونزادہ صاحب نے انہیں

ہدایت کی کہ وہ غونزہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر محسودوں کے علاقے میں چلے جائیں۔ علاقہ اورکزئی میں اخونزادہ صاحب ان کا آخری سہارا تھے لیکن جب وہاں قیام پریشان کن ہو گیا تو عجب خان اور اس کے ساتھیوں نے افغانستان جانے کا قصد کیا اور ۱۵ مئی ۱۹۲۳ء کو وہ نختر نو کی جانب روانہ ہوئے شام کو انہوں نے ملا محمود کے ساتھ روزہ افطار کیا جنہوں نے انہیں سامان لے جانے کیلئے چند خچر فراہم کئے۔ عجب خان نے اپنے اہل و عیال کو مسجد باغ کی طرف بھیجا اور خود دونوں بھائی تیراہ کے سید الم کے پاس گئے جس کی سفارش پر ملک منصور نے انہیں مندتہ نامی گاؤں میں رہائش کیلئے جگہ دی بعد میں وہ وہاں سے افغانستان اور تیراہ کی سرحد پر مورگہ نامی پہاڑ پر چلے گئے جہاں شنواریوں نے انہیں پناہ دی۔ شنواری قبائل نے ایک جرگے میں یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی نے قومی جرگے کے برعکس عجب خان کو کوئی گزند پہنچایا تو اس سے پچاس ہزار روپے جرمانہ وصول کیا جائیگا۔[41] عجب خان نے علاقہ شنواری میں نو دس مہینے قیام کیا۔

جب انگریز عجب خان کو پکڑنے میں ناکام رہے تو ان کے غصے کا نزلہ درہ آدم خیل کے قبائل پر پڑا۔ ۱۲ مئی ۱۹۲۳ء کو چیف کمشنر نے شنہ وڑئی میں گلی اقوام کے زرغون خیل، بوستی خیل، شیراکی تورسپری، حسن خیل کے اخوروال شاخ، جواکی کے اسماعیل خیل، قاسم خیل، ابراہیم خیل، جامو وال اور خیبر ایجنسی کے کوکی خیل، زخا خیل، قمبر خیل، ملک دین خیل، کمر خیل، اکا خیل اور سپاہ اور کزئی قبائل کے دولت زئی، فیروز خیل، بیزوٹی، علی شیر زئی، علی خیل، شیخان، ملا خیل، ربیعہ خیل، مشتی اور ماموزئی کے ایک مشترکہ جرگے کو ان کے مواجب بند کرنے اور ان کے خلاف فوجی کاروائی کی دھمکیاں دیں اور اس طرح انہیں عجب خان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرنے اور انہیں اپنے علاقے میں قیام کرنے کی اجازت نہ دینے پر مجبور کیا۔ ۱۵ مئی کو ماموزئی اور علی شیر زئی کے ایک جرگہ نے میانگاں غونزہ میں ان گھروں کو جلانے کا فیصلہ کیا جہاں عجب خان اور اس کے ساتھی قیام کر چکے

تھے اور اسی روز اس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا گیا۔[42]

۲۱ مئی ۱۹۲۳ء کو چیف کمشنر نے کوہاٹ میں آدم خیل کے ایک بڑے جرگے سے جو ۶۷ قبائلی زعماء پر مشتمل تھا ملاقات کی اور انہیں ایک یکطرفہ معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کیا اس معاہدے کے تحت درہ آدم خیل کے قبائل کو چھ ہفتے کے اندر اندر پچاس ہزار روپے (آ) جرمانہ ادا کرنے، بوستی خیل میں عجب خان اور علاقہ شیراکی میں کاونٹر خان کے گھروں کو مسمار کرنے، درہ میں ٹیلیفون لائن بچھانے، درہ کوہاٹ روڈ کو کشادہ کرنے اور درہ آدم خیل میں خاصہ داروں کی تین چوکیاں قائم کرنے پر مجبور کیا[43] گیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ستوری خیل، سپاہ، مانی خیل اور تیراہ کے بر محمد خیل کے ملکوں سے بھی اس معاہدے پر دستخط لئے حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر درہ کے قبائل ان شرائط کو ماننے پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر ۲۲ مئی کو کوہاٹ اور پشاور کی طرف سے ان پر حملہ کیا جائیگا جس کیلئے پہلے ہی سے انتظامات مکمل کر لئے گئے تھے اور فوج کو چوکس کر دیا گیا تھا۔[44]

ان اقدامات پر بھی انگریزوں کا انتقامی جذبہ ٹھنڈا نہیں ہوا بلکہ مختلف قبائل سے یہ ضمانت طلب کی گئی کہ وہ عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو اپنے علاقہ سے گزرنے یا قیام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسی ضمن میں ۱۵ مئی ۱۹۲۳ء کو کرم ایجنسی کے چمکنی اور ۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو ماموزئی، علی

(آ) درہ آدم خیل کے قبائل پر پچاس ہزار روپے کا جو جرمانہ لگایا گیا تھا اس میں ۳۲ ہزار روپے کا جرمانہ بوستی خیل پر، ۱۲ ہزار روپے جرمانہ شیراکی پر اور ۶ ہزار کا جرمانہ سنی خیل پر لگایا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے اورکزئی قبائل کے ماموزئی، علی شیرزئی، ملا خیل، مانی خیل، دولت زئی اور مشتی قبائل پر ۱۹۵۰۰ روپے کا جرمانہ عائد کیا۔

مردانگی اور جرات کا نشان۔ عجب خان

خیل، جوا کی اور کالاخیل کے ساتھ معاہدے کئے گئے جن کی رو سے مذکورہ قبائل نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ وہ عجب خان، شہزادہ خان، حیدر شاہ، سلطان میر اور گل اکبر کو اپنے علاقے میں پناہ نہیں دیں گے اور اگر وہ ان کے علاقے میں آجائیں تو انہیں حکومت کے حوالے کیا جائیگا[۴۵] اس کے علاوہ انگریزوں نے چاروں سمت اپنے جاسوس پھیلا دیئے جو ہر لمحے حکومت کو عجب خان اور اس کے ساتھیوں کی حرکات و سکنات کے متعلق رپورٹیں بھیجا کرتے تھے۔ انگریزوں نے حکومت افغانستان سے بھی عجب خان کی واپسی کا مطالبہ کیا جس پر جلال آباد کے گورنر نے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے چونکہ سانگو خیل شنواریوں نے عجب خان کو پناہ دی تھی اس لئے وہ کسی قیمت پر بھی عجب خان کو حکومت کے حوالہ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ جون کے پہلے ہفتے میں جلال آباد کے گورنر نے عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا لیکن انہوں نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کیا[۴۶] اسلئے جلال آباد کے سرحدار (انچارج) نے ان کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے۔ جون کے تیسرے ہفتے میں اچین کے گورنر (حاکم) نے سانگوخیل سے عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو حوالہ کرنے کا مطالبہ کیا لیکن انہوں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا آخر ۱۷ جولائی ۱۹۲۳ء کو عجب خان اپنے ساتھیوں سمیت اچین کے گورنر کے سامنے پیش ہوا اور جلال آباد کے گورنر نے ان کو ضمانت پر رہا کر دیا۔[۴۷]

عجب خان دشمن کے مظالم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا رہا مگر جب یہ حد سے تجاوز کر گئے تو اس نے ۸ ستمبر ۱۹۲۳ء کو پاڑہ چنار میں کیپٹن واٹس اور اس کی بیوی کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا اس سے قبل عجب خان نے انگریزوں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنے وعدے کے مطابق شیر خان پنجابی اور اللہ یار خان سوماری کو رہا نہ کیا تو وہ ایک اور انگریز کو اغوا کرنے سے دریغ نہیں کرے گا اور پھر اس سے وہی سلوک کیا جائیگا جو اس کے ساتھیوں سے کیا گیا ہے[۴۸]۔ انگریزوں نے عجب خان کی اس دھمکی کو کوئی وقعت نہیں دی لیکن پختونولی کے اصولوں کے تحت عجب خان اپنے ساتھیوں کو

مس ایلس کے اغوا کے ڈرامے کا اہم کردار۔ شہزادہ خان

انگریزوں کے قیدوبند سے چھڑانے کا پابند تھا۔ ناگفتہ بہ حالات میں بھی وہ اپنے عہد کی پاسداری کرنا چاہتا تھا انگریزوں کی زیادتی کی وجہ سے اس پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے وہ بے یارومددگار ہو چکا تھا۔ اپنے اس کیلئے غیر بن چکے تھے اسے سر چھپانے کیلئے کوئی جگہ میسر نہ تھی اور وہ ایک گم کردہ راہ کے مسافر کی طرح ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ بے شمار جاسوس اور تیس (۳۰) ہزار روپے کے انعام کے لالچی شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے لیکن تمام آلام ومصائب کے باوجود اس کا حوصلہ بلند اور عزم جوان تھا۔ شنواریوں نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا اور موضع مندتہ کے ملک تبر شنواری نے نہ صرف عجب خان اور اس کے ساتھیوں کو پناہ دی بلکہ نازیاں اور مندتہ کے لشکر کی مدد سے انگریزوں کے جاسوس کے گھر بھی جلائے۔[۴۹]

انگریز اگر ایک طرف افغانستان کی حکومت پر عجب خان کی حوالگی کیلئے دباؤ ڈال رہے تھے تو دوسری طرف خیبر ایجنسی کے قبائل سے بھی متواتر یہ مطالبہ کرتے رہے کہ وہ عجب خان کو پکڑ کر حکومت کے حوالے کریں اور یا اسے قتل کروا کر اپنے گریباں کو تار تار ہونے سے بچائیں۔ عجب خان نہایت جرات کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتا رہا لیکن آخر کار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ انگریزوں کی یکطرفہ کاروائیوں پر اتنا برافروختہ ہوا کہ اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ۷ ستمبر ۱۹۲۳ء کو شہزادہ خان، عالم خان اور سازمیر شنواری کے ساتھ پاڑہ چنار میں کیپٹن واٹس پر حملہ کر دیا جو کرم ملیشیا کے کمانڈنٹ میجر کیمبل کے بنگلے کے ایک حصہ میں مقیم تھا۔[۵۰] وقوعہ کی رات کیپٹن اور مسز واٹس نے کرم ملیشیا کے مس میں میجر کیمبل اور کیپٹن برڈوڈ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور گیارہ بجے واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ شہزادہ خان کے مطابق جب وہ کیپٹن واٹس کے بنگلے پر پہنچے اس وقت ایک سپاہی بنگلے کے باہر پہرہ دے رہا تھا عجب خان نے مکا مار کر کمرے کے دروازے کا شیشہ توڑا۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز پر مسز واٹس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنے شوہر کو بھی جگایا لیکن کیپٹن

وائس اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر پھر سوگیا۔ عجب خان کی خواہش تھی کہ کیپٹن اور مسز وائس کو کوئی گزند پہنچائے بغیر اغوا کیا جائے اسلئے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عجب خان، شہزادہ خان اور عالم خان کمرے کے اندر داخل ہو گئے اور ان کا شنواری ساتھی باہر کھڑا رہا۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مسز وائس پھر جاگ اٹھی اور اپنے دو کتوں کو پکارا۔ جیسے ہی کتے عجب خان پر حملہ آور ہوئے تو اس نے ایک کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بندوق کے فائر کے ساتھ ہی کیپٹن وائس نے عجب خان پر حملہ کیا لیکن شہزادہ خان اپنے بھائی کی مدد کیلئے موجود تھا اور اس نے کیپٹن وائس پر ایسا وار کیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اپنے خاوند کو خون میں لت پت دیکھ کر مسز وائس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا لیکن عالم خان نے اسے بھی ایک گولی سے خاموش کر دیا اور اس طرح اغوا کا یہ منصوبہ ناکام رہنے کے بعد عجب خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ خوست کی طرف روانہ ہوا اور کسی کو بھی ان کا تعاقب کرنے کی جرات نہ ہوئی۔[۵۱]

۸ تاریخ کو جب کیپٹن وائس کا نوکر بنگلے پر آیا تو میاں بیوی دونوں کو خون میں لت پت پایا۔ اس نے اس واقعہ کی اطلاع فوراً میجر کیمبل کو دی جس نے کمرے کے معائنے کے دوران کیپٹن اور مسز وائس کے علاوہ ایک کتا بھی مردہ پایا جبکہ دوسرا کتا خوف کے مارے لحاف پر خاموش بیٹھا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میجر کیمبل کے کمرے کے نزدیک رات کو اتنا ہنگامہ ہوا تھا لیکن میجر کیمبل اور اس کے دونوں کتوں میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی چونکہ کرم ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ اس روز پشاور میں تھے اسلئے میجر کیمبل نے کیپٹن اور مسز وائس کی ہلاکت کی اطلاع چیف کمشنر کو بذریعہ تار دی اور چیف کمشنر ۸ تاریخ کو شام ۶ بجے پاڑاچنار پہنچا۔ قتل کی اس دلیرانہ واردات نے انگریزوں میں خوف و ہراس کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور چیف کمشنر نے مرکزی حکومت سے بنوں اور کوہاٹ چھاؤنیوں کی حفاظت کیلئے دو سو (۲۰۰) لیویز بھرتی کرنے کی اجازت طلب کی۔[۵۲]

خان بہادر قلی خان نے پولیٹیکل ایجنٹ کی عدم موجودگی میں کیپٹن وائس کے قاتلوں کو

گرفتاری کیلئے ضروری اقدامات کئے۔ خان بہادر صاحب خود پاڑہ چمکنی گئے اور وہاں کے قبائل کو عجب خان کے تعاقب میں بھیجا اس کے علاوہ گھڑ سوار ملیشیا کا ایک دستہ پاڑہ چنار کی مغربی اطراف میں، ملیشیا کے دو پلاٹون زیڑان تنگی، دو پلاٹون کڑمان تنگی، ایک پلاٹون خرلاچی، ایک پلاٹون پیواڑ اور رنگروٹوں کا ایک دستہ احمدزئی کی طرف بھیجا گیا ملیشیا کی سب چوکیوں کو اطلاع دے دی گئی اور ان کو حکم دیا گیا کہ افغانستان کی طرف جانے والے تمام راستے بند کئے جائیں[۵۳] مگر ان تمام اقدامات کے باوجود بھی عجب خان ان کے ہاتھ نہ آسکا۔ اس واقعہ کے بعد انگریزوں کو اپنی حفاظت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ مردان کے اسسٹنٹ کمشنر نے پشاور کے ڈپٹی کمشنر کو ایک خط میں لکھا کہ مردان میں ڈنمارک کی خواتین کی حفاظت کیلئے موجودہ پانچ چوکیدار اس شرط پر کافی ہیں کہ عجب خان علاقہ مہمند میں نہ آنے پائے اور وہاں اگر عجب خان کی موجودگی کی خبر ہو تو پھر اس مشن کو بند کر دیا جائے اور مشن سے منسلک خواتین کو صوبہ سرحد سے باہر جانے کی ہدایت کی جائے۔[۵۴]

۲۲ نومبر ۱۹۲۳ء کو پشاور میں تمام انگریزوں کو ہدایت کی گئی کہ جو افسر چھاؤنی کی حدود سے باہر پشاور، نوشہرہ، لنڈی خانہ، کوہاٹ اور چراٹ روڈ پر موٹروں میں سفر کرتے ہیں ان کے پاس کم از کم دو بندوقیں ہونی چاہئیں اور جو افسر اکیلے یا ہندوستانی ڈرائیور کی معیت میں سفر کرتے ہوں وہ اپنی حفاظت کیلئے کم از کم ایک مسلح سپاہی ساتھ رکھیں گے۔ اسی طرح موٹر سائیکلوں پر سفر کرنے والے انگریزوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے پاس بندوق یا پستول اور کم از کم بیس (۲۰) کارتوس ضرور رکھیں گے۔[۵۵] صوبہ سرحد کے چیف کمشنر نے ۲ دسمبر ۱۹۲۳ء کو یہ حکم جاری کیا کہ پشاور اور کوہاٹ کے درمیان سفر کرنے والے افسر نہ صرف خود مسلح ہونگے بلکہ وہ اپنی حفاظت کیلئے ایک مسلح اردلی بھی ساتھ رکھیں گے اس کے علاوہ سول افسر بھی بعد از دوپہر چھاؤنی کی حدود سے باہر سفر نہیں کریں گے۔ اسی طرح پشاور چھاؤنی کی فوج کے جنرل سٹاف نے ۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک حکم نامہ جاری کیا جس میں تمام افسروں کو ہدایت کی

گئی تھی کہ وہ ہر وقت اپنے پاس کارتوس سے بھرے ہوئے پستول رکھیں گے اور خواتین کو اس وقت تک چھاؤنی کی حدود سے باہر موٹروں میں گھومنے پھرنے کی اجازت نہ ہوگی جب تک سفر کے دوران ان کے ساتھ ایک افسر یا کوئی دوسرا مرد نہ ہو۔ کوئی موٹر غروب افتاب کے بعد چھاؤنی کے حدود سے باہر نہیں جائیگی۔[۵۶]

۲ جنوری ۱۹۲۴ء کو مشن ہسپتال کی ایک لیڈی ڈاکٹر مس ڈیوڈسن کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ عجب خان کے متوقع حملے کے پیش نظر شام کے بعد گھومنا پھرنا ترک کردے اور ہسپتال کے سربراہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ اسے شام کے بعد گھومنے پھرنے سے باز رکھے۔ بسٹر گاڈوین کے قول کے مطابق شہزادہ خان نے اس کو بھی اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اسی سلسلہ میں شہزادہ خان اسے اغوا کرنے کی غرض سے ایک روز تخت نامی گاؤں میں آیا۔ رات وہیں ٹھہرا اور اس کے گھر پر حملہ کیا لیکن خوش قسمتی سے وہ چشمئی نامی جگہ گشت پر گیا ہوا تھا جہاں اس نے رات بسر کی۔ دوسری رات شہزادہ خان نے پھر اس کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر اسی رات بھی وہ گھر میں موجود نہیں تھا اس موقع پر شہزادہ خان کے ایک ساتھی نے اس کے بیرے کو لے جانے کی تجویز پیش کی مگر شہزادہ خان نے کہا "مجھے مسلمان کی نہیں بلکہ فرنگی کی ضرورت ہے"۔ اس کے بعد گاڈوین حفاظتی اقدام کے طور پر صحن میں سونے کی بجائے برج میں سونے لگا۔[۵۷]

کیپٹن واٹس کے قتل کے بعد انگریزوں نے عجب خان کو گرفتار کرنے کیلئے اپنی کوششیں تیز تر کردیں اور حکومت افغانستان سے از سر نو عجب خان کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح حکومت

بسٹر گاڈوین ملازمت کے سلسلہ میں ۲۲ سال تک علاقہ خٹک میں مقیم رہا۔

نے خیبر کے آفریدی قبائل پر زور دیا کہ وہ حکومت کی تسلی کرادیں کہ عجب خان ان کے علاقہ میں موجود نہیں۔ اس مقصد کیلئے ۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء کو سپین درند میں ایک بڑا جرگہ منعقد ہوا جس میں تقریباً تین ہزار افراد نے شرکت کی۔ جرگے میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر قبائلی ملک اپنی اپنی حدود میں عجب خان کا پتہ چلانے کا ذمہ دار ہوگا۔ اسی لشکر نے سلیمی کنڈاؤ اور مرزاتل تک کا علاقہ چھان مارا لیکن عجب خان ان کے ہاتھ نہ آیا۔[۵۸] ۱۵ نومبر کو آفریدی لشکر نے ننگروسہ درہ کے پہاڑوں کا چپہ چپہ چھان مارا اور پھر ۱۸ نومبر کو سانگو خیل شنواریوں کے ساتھ ایک جرگہ کیا مگر شنواری عجب خان کی موجودگی سے صریحاً انکار کرتے رہے۔ اس کے بعد حکومت نے عجب خان کی گرفتاری کیلئے تیس (۳۰) ہزار روپے انعام کا اعلان کیا۔[۵۹]

انگریز اب عجب خان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کے ساتھ ساتھ کئی بے گناہ انسانوں کا خون بہانے کا ارادہ کرچکے تھے اسلئے اس مرد کوہستانی نے اپنے غیور ہموطنوں کو سلام عقیدت پیش کرتے ہوئے افغانستان کا رخ کیا لیکن انگریز نے اسے وہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا سفارتی سطح پر اس کی حوالگی کیلئے کوششیں شروع کی گئیں اور معاہدہ افغانستان کی اس دفعہ کی آڑ لے کر کہ ایک ملک کے باشندے دوسرے ملک میں ہنگامہ آرائی نہیں کریں گے، عجب خان اور اس کے رفقا کو انگریزوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا چونکہ معاہدہ مذکورہ میں ایسی حوالگی کا ذکر نہ تھا اسلئے افغانستان کی حکومت نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔ جب انگریز کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اسے ہندوستان کی سرحد سے دور رکھا جائے۔ انگریزوں کے نزدیک عجب خان کی حیثیت ایک دہشت پسند اور باغی کی تھی اور اس خوف اور دہشت سے جان چھڑانے کیلئے امیر امان اللہ خان کو مجبور کیا کہ وہ اس "ہوے" کو انگریز کی عملداری سے دور لے جائے اسی سلسلہ میں مختلف حربے استعمال کئے گئے جن میں اسلحہ کی ترسیل کو روکنا اور تجارتی راستوں کو مسدود کرنا شامل تھا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں جب افغانستان کیلئے یورپ سے اسلحہ کی ایک کھیپ بمبئی پہنچی تو انگریز نے اسے وہیں روک لیا۔ یہ اقدام اس معاہدے

کے منافی تھا جو ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو افغانستان اور حکومت ہند کے درمیان ہوا تھا۔[۶۰]

اسلحہ کی کھیپ روکنے کے علاوہ انگریزوں نے خیبر، کرم، ٹوچی اور سرحد کے دوسرے راستوں افغانستان کے ساتھ تجارت پر پابندیاں عائد کرنے کی ایک تجویز پر بھی غور شروع کیا چونکہ افغانستان کی تجارت ہندوستان کے راستے ہوتی تھی اسلئے اسلحہ کی رکاوٹ اور تجارت بند کرنے کی تجویز سے سنگین صورت حال پیدا ہو گئی بالاخر حکومت افغانستان عجب خان کو ہندوستانی سرحد سے کافی دور رکھنے پر رضامند ہوگئی۔ عجب خان کو مزار شریف میں رہنے کی اجازت ملی اور وہ ۱۲ اپریل ۱۹۲۴ء کو وہیں آباد ہو گیا۔[۶۱] شہزادہ خان کے بیان کے مطابق حکومت نے عجب خان کو بارہ سو جریب، شہزادہ خان کو چھ سو جریب، اسمل خان (عجب خان کا چچا) کو چار سو جریب اور حیدر شاہ کو دو سو جریب زمین عطا کی لیکن پھر بھی انگریزوں نے حکومت افغانستان سے مطالبہ کیا کہ عجب خان اور شہزادہ خان اسلحہ کے بغیر پھرا کریں گے انہیں ترکستان کے محدود علاقہ میں زیرنگرانی رکھا جائیگا اور افغانستان کی حکومت انہیں نہ ہندوستان کی سرحد کے قریب آنے کی اجازت اور نہ کوئی الاؤنس دے گی۔ ان شرائط کی منظوری کے بعد انگریزوں نے حکومت افغانستان کا اسلحہ وا گزار کرنے کے احکامات جاری کئے۔[۶۲]

عجب خان نے افغانستان میں بھی جرات اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور غاصب حکمران بچہ سقہ کے خلاف جنرل نادر خان کی بھرپور مدد کی وہ بچہ سقہ کے خلاف لڑائی میں زخمی ہوا اس کے گھر کو تاخت و تاراج کیا گیا لیکن عجب خان نے مالی و جانی نقصان کی کوئی پرواہ نہ کی۔[۶۳] مس ایلس کے ڈرامے کا یہ ہیرو جولائی ۱۹۶۱ء اور اس کا مشہور کردار شہزادہ خان اگست ۱۹۷۵ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے لیکن ان مجاہدوں کا کردار جو کہ ایک لوک داستان کے کردار کی سی حیثیت رکھتا ہے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ عجب خان، شہزادہ خان اور حیدر شاہ نے افغانستان میں مستقل سکونت اختیار کی مگر ان کے دو ساتھی سلطان میر اور گل اکبر ترکستان جانے پر آمادہ نہ ہوئے اور جلال آباد کے حاکم نے انہیں

واپس بھیج دیا۔[۶۴] سلطان میر بھی اپنی انگریز دشمنی کیلئے مشہور تھا وہ خود ۱۲ لانسر اور کرنل فوکس کے قتل میں اور اس کا بیٹا گل اکبر مس ایلس کے اغوا میں ملوث تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ اس نے تیراہ میں مس ایلس کو اپنے گھر ٹھہرایا اور عجب خان کو بھی پناہ دی۔

۲۹ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ڈپٹی کمشنر کوہاٹ نے کرنل فوکس کے قتل کے سلسلہ میں تیراہ جواکی کے ایک جرگے سے ملاقات کی اور اس سے سلطان میر، میرک اور قاسم اللہ کی حوالگی کا پرزور مطالبہ کیا مگر قبائلی زعماء نے اس مطالبے کو ماننے سے پہلوتہی کی۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر جواکی قبائل مذکورہ تین افراد کو اپنے علاقے سے نکالنے کے ساتھ ساتھ ان کے گھر بھی نذر آتش کردیں تو حکومت اس کے بدلے ان کے جرمانے کا بیشتر حصہ معاف کر دے گی[۶۵] مگر یہ جرگہ کوئی فیصلہ کئے بغیر ختم ہوا اور دوسرے جرگے کیلئے ۶ فروری ۱۹۲۲ء کی تاریخ مقرر کی گئی چونکہ اس تاریخ کو بھی جرگہ منعقد نہ ہو سکا اسلئے حکومت نے راولپنڈی اور بمبئی میں جواکی قبائل کے دس، پندرہ افراد کو حراست میں لے لیا اور کچھ عرصہ بعد انہیں اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ اپنے قبیلے کو انگریزوں کی شرائط ماننے پر آمادہ کریں گے[۶۶] جب اس طرح سے بھی انگریز کی مطلب براری نہ ہوئی تو پھر حکومت نے ۱۶ جون ۱۹۲۲ء کو جواکی قبائل پر بارہ ہزار روپے کا جرمانہ عائد کر دیا اور علی خیل اور ماموزئی قبائل کو ہدایت کی کہ وہ اپنے علاقہ میں جواکی قبائل کی آمدورفت پر پابندیاں عائد کردیں۔ اس سے قبل قبیلہ علی خیل کے دو ملکوں نے حکومت کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ جواکی قبائل کی آمدورفت بند کرنے کے سلسلہ میں حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کریں گے لیکن جب علی خیل کے قبائلی زعماء کو ان دو ملکوں کے عزائم کا پتہ چلا تو انہوں نے ۲۰ فروری ۱۹۲۳ء کو انگریزوں کی مدد اور حمایت کرنے پر ان کے گھروں کو آگ لگادی۔[۶۷]

فروری ۱۹۲۴ء میں سلطان میر اور گل اکبر، عجب خان کے ساتھ جلال آباد چلے گئے لیکن انہوں

نے ترکستان جانے پر آمادگی ظاہر نہیں کی اور جلال آباد کے گورنر سے افغانستان کے مشرقی علاقے میں رہنے کی درخواست کی مگر گورنر نے ان کی یہ درخواست مسترد کی اسلئے وہ وہاں سے میدان (تیراہ) واپس چلے آئے۔ جہاں انہوں نے اپنے مسمار شدہ گھروں کی تعمیر شروع کی مگر قبیلہ قمبر خیل کی مخالفت کے بنا پر وہ اپنے گھروں کو نہ بسا سکے۔ اسی دوران انہیں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ایک طرف انگریز ان کے خون کے پیاسے تھے اور دوسری طرف قبیلہ میں ان کے دشمن ان پر کاری ضرب لگانے کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انگریز نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان میر کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں سلطان میر کے خلاف صف آرا کرنے کیلئے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کئے۔

مئی ۱۹۲۵ء میں سلطان میر کے مخالفین نے اس کے چچازاد بھائی کو زخمی کردیا۔ اسی سال اگست کے مہینے میں سلطان میر نے ملا سید اکبر اور ملا محمود اخونزادہ کے تعاون سے اپنے مسمار شدہ گھروں کو از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اسے اپنی مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور بات دنگہ فساد اور لڑائی تک جا پہنچی اس لڑائی میں فریقین کا ایک ایک آدمی ہلاک اور دو، دو زخمی ہوئے۔ اسی سال دسمبر کے مہینے میں سلطان میر اور اس کے مخالفین کے مابین ایک لڑائی میں سلطان میر کا ایک ساتھی زخمی ہوا۔ یہ لڑائی ۱۹۲۶ء میں بھی جاری رہی اور ۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں دونوں طرف سے ایک ایک آدمی زخمی ہوا۔ یہ لڑائی جاری تھی کہ ۹ مئی ۱۹۲۷ء کو سلطان میر کا بیٹا گل اکبر پشاور میں گرفتار کرلیا گیا۔ گل اکبر مئی ۱۹۲۷ء میں افغان بریگیڈئیر زرخان سے ملاقات کرنے کی غرض سے بیرمل چلا گیا چونکہ گل اکبر کی گرفتاری کیلئے انعام کا اعلان کیا گیا تھا اسلئے حریف خان شودیا کی وزیر گل اکبر سے شناسائی پیدا کرنے کی غرض سے بیرمل پہنچا اور زرخان کے چچازاد بھائی خانہ میر نے گل اکبر سے اس کی ملاقات اسی شرط پر کرائی کہ مقررہ انعام میں سے ڈھائی ہزار روپے اس کو دیئے جائیں گے[۶۸] اگرچہ اس وقت حریف خان کی عمر پچیس (۲۵) سال تھی لیکن ہوشیاری اور تجربے کے لحاظ سے وہ پختہ ذہن کا مالک تھا۔ اس نے

نہایت چالاکی کے ساتھ گل اکبر کو اپنے دام عیاری میں پھنسایا اور اپنے ساتھ پشاور چلنے پر آمادہ کرلیا۔

گل اکبر اور حریف خان، مئی ۱۹۲۷ء کو سپین وام سے ٹل کے راستے پشاور روانہ ہوئے انہوں نے دوپہر کا کھانا ٹل میں کھایا اور پھر وہاں سے ریل گاڑی کے ذریعے کوہاٹ روانہ ہوئے۔ کوہاٹ کی ایک سرائے میں رات بسر کرنے کے بعد وہ صبح ۸ بجے پشاور روانہ ہوئے اور ڈبگری بازار کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ جب گل اکبر کی آنکھ لگ گئی تو حریف خان خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس پہنچا اور پچاس (۵۰) ہزار روپے انعام کے عوض گل اکبر کو حکومت کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے بیس (۲۰) ہزار روپے میں گل اکبر کا سودا چکانے کی پیشکش کی مگر حریف خان اتنی رقم قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ کافی بحث وتمحیص کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ نے حریف خان کو تیس ہزار روپے کی پیشکش کی اور حریف خان نے اس رقم کے بدلے ۹ تاریخ کو شام کے وقت گل اکبر کو خیبر ایجنسی کے خاصہ داروں کے ہاتھوں گرفتار کرادیا۔ گرفتاری کے بعد گل اکبر نے اپنا نام غنم شاہ اور قبیلے کا نام ملک دین خیل بتایا۔[۶۹]

گل اکبر کی گرفتاری کے بعد کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے چیف کمشنر سے درخواست کی کہ گل اکبر پر زیر دفعہ ۳۹۶،۳۰۲ تعزیرات ہند کوہاٹ میں مقدمہ چلایا جائے کیونکہ مسز ایلس کو کوہاٹ میں قتل کیا گیا تھا۔ چیف کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے گل اکبر کو فرنٹیئر کنسٹبلری کے ایک مسلح دستے کی نگرانی میں کوہاٹ بھیجا۔ کوہاٹ میں جب اس پر مقدمہ شروع ہوا تو اس نے مجسٹریٹ کو اپنا نام غنم شاہ ولد نوران شاہ ملک دین خیل بتایا۔ انگریزوں نے گل اکبر کی شناخت کے سلسلہ میں کئی افراد سے پوچھ گچھ کی لیکن قبائل دشمنی کے خوف سے اس کی شناخت کرنے سے پہلوتہی کرتے رہے۔ آخر اسے ۲۹ مئی ۱۹۲۷ء کو کوہاٹ میں پھانسی دی گئی اور وہیں دفن کردیا گیا۔[۷۰] ۳۰ مئی کو تیراہ جواکی کی ایک عمر رسیدہ خاتون بی بی گلہ جیل آئی اور جیلر سے گل اکبر کے کپڑوں کی

واپسی کی درخواست کی مگر ڈپٹی کمشنر نے اس کی درخواست مسترد کی اور گل اکبر کے کپڑوں کو جلانے کا حکم صادر کیا۔ گل اکبر کی موت پر سلطان میر کو سخت صدمہ پہنچا اور اس وقت تک سکھ کا سانس نہ لیا جب تک گل اکبر کو شناخت کرنے والے تینوں افراد کی جان نہ لے لی۔

انگریزوں کو رپوٹیں مل رہی تھیں کہ سلطان میر درہ آدم خیل میں اپنے دوستوں کی مدد سے انگریزوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے اسلئے حکومت نے حفاظتی اقدامات کیئے۔ ۱۴ مئی ۱۹۲۷ء کو تمام انگریزوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ غروب آفتاب کے بعد چھاؤنی کے حدود کے اندر رہیں اور کوئی خاتون چھاؤنی کی حدود سے باہر موٹر میں تنہا سفر نہ کرے۔ ۲۴ جون ۱۹۲۷ء کو دوسرا حکم نامہ جاری کیا گیا جس کی رو سے انگریزوں کو شام کے بعد پشاور کوہاٹ روڈ پر سفر نہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔[72]

گل اکبر کی موت کے بعد سلطان میر نے ملک دین خیل سے شکایت کی کہ تیراہ کے بعض افراد نے گل اکبر کی گرفتاری کے سلسلہ میں انگریزوں کی مدد کی تھی اس ضمن میں اس نے میاں سید کبیر پر دعوی کیا۔ ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو تیراہ کے علماء نے نماز جمعہ کے بعد مخبروں کے خلاف کاروائی کرنے کا مطالبہ کیا لیکن سید کبیر اپنی بے گناہی کے ثبوت میں قسم کھانے پر آمادہ ہوا۔ ۱۷ جون کو نماز جمعہ کے موقع پر ایک دفعہ پھر گل اکبر کی موت کا سوال اٹھایا گیا اس دن آفریدیوں نے میدان میں ایک بڑا جرگہ منعقد کیا اور صوبیدار لعل میر اور لعل اکبر ملک دین خیل کی سرکردگی میں پندرہ سو قبائل پر مشتمل لشکر سید کبیر پر حملے کیلئے روانہ ہوا لیکن سید کبیر نے یہ کہتے ہوئے جان چھڑائی کہ تیراہ جواکی کے چند افراد اسی جرم میں ملوث ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطان میر کے دولڑکوں میر اکبر اور گل حیدر نے گل اکبر کی شناخت کا الزام شیر باز اور نادر شیر پر لگایا اسلئے آفریدی لشکر نے شیر باز، یاغی شاہ اور سید علی ہیبت خیل اور تازہ گل اسماعیل خیل کے گھروں کو مسمار کیا یہ لشکر زیادہ تر ملک دین خیل پر مشتمل تھا۔ ۲۲ جون ۱۹۲۷ء کو آفریدیوں نے ایک جرگے میں سلطان میر کو بے قصور گردانتے ہوئے اسے اپنا مسمار شدہ

گھر بنانے کی اجازت دے دی اس فیصلے کے جواز میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ مس ایلس کی رہائی کے وقت انگریزوں نے ملا محمود اخونزادہ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ علاقائی ذمہ داری کے تحت نہ قبائل پر جرمانہ لگایا جائیگا اور نہ عجب خان، سلطان میر اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کاروائی کی جائیگی[73] اسی سلسلہ میں اخونزادہ محمود کے بھائی عبدالحمید نے چیف کمشنر سے ملاقات کی اور انہیں حکومت کا یہ وعدہ یاد دلایا کہ اگر عجب خان کسی نئے جرم کا مرتکب نہ پایا گیا تو اس کے رشتہ داروں کو کچھ نہیں کہا جائیگا۔ عبدالحمید نے چیف کمشنر پر واضح کیا کہ مس ایلس کی رہائی ان کے کہنے پر عمل میں آئی تھی اور اس کے پاس خان بہادر مغل باز خان اور خان بہادر قلی خان کا دستخط شدہ خط بطور ثبوت موجود ہے اس کے علاوہ حکومت نے ملک زمان خان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ عجب خان کو اپنے علاقے سے نکال دیں تو ان کے رشتہ داروں کو کچھ نہیں کہا جائیگا۔[74] ۱۲ اپریل ۱۹۲۳ء کے اس خط کا متن یہ تھا۔

"اخونزادہ مے خواہند کہ بدمعاشاں مس صاحبہ کو کسی نے راستہ میں امداد نہیں دی اور رات رات مس صاحبہ کو علاقہ سرکار اور علاقہ غیر میں لے گئے ہیں اور کوئی جرم غریب رعایا پر ذمہ داری حدود علاقہ غیر کا جرمانہ نہ کیا جائے اسلئے یہ تحریر دی جاتی ہے کہ اس معاملہ میں حدودات کی ذمہ داری کا جرمانہ نہیں کیا جائیگا۔"

ایک رپورٹ کے مطابق یہ خط خان بہادر قلی خان نے لکھا تھا اور خان بہادر مغل باز خان نے اس پر دستخط کیئے تھے۔ چیف کمشنر مسٹر بولٹن نے عبدالحمید کی شکایت پر مغل باز خان اور قلی خان کے تحریری بیانات لئے۔ خان بہادر مغل باز خان نے اس قسم کے وعدوں سے لاعلمی کا اظہار کیا لیکن خان بہادر قلی خان نے اپنے بیان میں یہ حقیقت تسلیم کی کہ اخونزادہ اسی شرط پر مس ایلس کو عجب خان کے گھر سے لائے تھے کہ مس ایلس کو اس وقت تک باباجی صاحب کی زیارت سے آگے جانے کی اجازت نہیں دی جائیگی جب تک تین قیدی عالم خان، اللہ یار خان سوماری اور شیر خان پنجابی رہا نہ ہو جائیں۔[75]

اللہ یار خان سوماری کے مقدمے کے سلسلہ میں خان .بہادر قلی خان نے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر گریفتھ کے استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ اسے سزا دینا وعدہ خلافی ہو گی۔[۷۶]

سلطان میر کو سزا دینے کی کوششوں کے سلسلہ میں حکومت نے ۱۴ جنوری ۱۹۲۸ء کو کوہاٹ میں اورکزئی قبیلہ کے ۲۷۰ قبائل کو گرفتار کرنے کے بعد بطور یرغمال رکھا اور سلطان میر کی حوالگی کا مطالبہ کیا لیکن جب یہ حربہ کارگر ثابت نہ ہوا تو پھر چیف کمشنر نے غصے کے عالم میں علاقہ اورکزئی پر ہوائی جہازوں کے ایک مظاہرے کی اجازت طلب کی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر اورکزیوں نے آفریدیوں پر سلطان میر کا ساتھ دینے کا الزام لگایا تو پھر ملک دین خیل، قمبر خیل اور کوکی خیل سے برآمنۃ کرنے اور ان کے علاقے پر ہوائی جہازوں کی پرواز کا جواز پیدا ہو جائیگا۔ مرکزی حکومت نے چیف کمشنر کی یہ تجویز اس شرط پر منظور کی کہ ہوائی جہاز قبائلی علاقہ پر بمباری نہیں کریں گے۔ ۲۱ جنوری ۱۹۲۸ء کو درہ خانکی اور وادی مستورہ پر ۲۰ ہوائی جہازوں نے پرواز کے ذریعے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا[۷۷] مگر اس مظاہرے کے باوجود بھی قبائل کے سر انگریزوں کے آگے خم نہیں ہوئے انہوں نے سلطان میر کو بدستور اپنے علاقے میں رکھا۔

سلطان میر کے علاوہ انگریزوں نے درہ آدم خیل میں عجب خان کے دیگر رفقا کو بھی گزند پہنچانے سے دریغ نہیں کیا۔ عجب خان کے ان ساتھیوں میں صوبیدار کاونٹر خان شیراکی اور اس کے

شیراکی کے کاونٹر خان ۱۸۹۹ء میں سمانہ رائفلز میں بحثیت حوالدار بھرتی ہوئے کچھ عرصہ بعد اسے جمعدار اور بعد میں صوبیدار کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ ۱۹۱۹ء تک وہ جنوبی وزیرستان میں اسی عہدہ پر فائز رہے لیکن اسی سال ملیشیا میں آدم خیل آفریدیوں کی کمپنیاں توڑدی گیئں اور کاونٹر خان کو پنشن دے دی گئی لیکن کوہاٹ کے پولیٹیکل افسر ڈگلس ڈانلڈ نے اسے کوہاٹ لیویز میں بطور صوبیدار بھرتی کیا اور وہ ۱۹۲۰ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

بیٹوں کے نام شامل ہیں۔ کاونٹر خان نے ہجرت اور خلافت کی تحریکوں کے اغاز کے ساتھ ہی قومی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا اس نے ۱۶ اگست ۱۹۲۰ء کو اقوام شیراکی کے آفریدیوں کو کوہاٹ لیویز سے مستعفی ہونے کا مشورہ دیا اور ۲۵ اگست کو ۲۵ شیراکی آدم خیل قبائل نے اس کی ترغیب پر استعفیٰ دے دیا اور ایک احتجاجی جلوس کی شکل میں کوہاٹ کے گلی کوچوں کا گشت کیا۔[۷۸] اس سے قبل کاونٹر خان نے ۱۷ اگست کو درہ آدم خیل کے ملکوں کے ہمراہ کنڈاؤ میں حسن خیل آفریدیوں کے ساتھ ایک جرگہ میں فیصلہ کیا تھا کہ حکومت کے جاسوسوں سے نہ صرف ایک ہزار روپے جرمانہ وصول کیا جائیگا بلکہ ان کے گھروں کو بھی جلایا جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جوا کی اور ۱۴ نومبر کو بوستی خیل اقوام کے آفریدیوں نے لیویز سے استعفیٰ دیتے ہوئے کوتل کی چوکی کو خالی کر دیا۔ انگریز کاونٹر خان کے خلاف کاروائی کرنے کیلئے تاک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ۱۹ اگست ۱۹۲۰ء کو انہیں اس کے خلاف کاروائی کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا اسی دن کوہاٹ لیویز کے ایک سپاہی گلاب شیر نے بھگوڑا ہونے کے بعد کاونٹر خان کے ہاں پناہ لی۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۰ء کو گلاب شیر کو قتل کیا گیا اس کے قتل کا دعویٰ کاونٹر خان کے دولڑکوں گل خان اور شیر خان پر کیا گیا[۷۹] اور اسی سلسلہ میں حکومت نے ان کو ہر ممکن ایذا پہنچائی ۱۹۱۹ء میں ۱۳ لانسر کے گارڈ پر جو حملہ ہوا تھا اس کا دعویٰ عجب خان کے علاوہ گل خان اور شیر خان پر بھی کیا گیا تھا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق اس حملہ میں چار بندوقیں کاونٹر خان کے بیٹوں کے حصے میں آئی تھیں لیکن ملک گل خان اور شہزادہ خان کے مطابق شیر خان اور گل خان نہ اس حملے میں شریک تھے اور نہ انہیں کوئی بندوق ملی تھی۔[۸۰] نومبر ۱۹۲۰ء میں جب کرنل فوکس اور اس کی بیوی قتل ہوئے تو ان کے قتل کا دعویٰ دیگر افراد کے علاوہ گل خان اور شیر خان پر بھی کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے انہیں پیش ہونے کا حکم دیا لیکن وہ اس حکم کی تعمیل سے قاصر رہے اسلئے ڈپٹی کمشنر نے حکومت کو کاونٹر خان کی پنشن بند کرنے، محمد زئی اور کاغذی میں

اس کی زمین بحق سرکار ضبط کرنے، اس سے سرکاری اعزازات اور تمغے واپس لینے اور اس کے گاؤں کو نذر آتش کرنے کی سفارش کی۔ چیف کمشنر نے ان سفارشات کی منظوری کے ساتھ ساتھ کاونٹر خان کے بیٹوں کی گرفتاری کے وارنٹ بھی جاری کردیئے اس حکم کی رو سے ۱۵ دسمبر ۱۹۲۰ء کو کاغذی اور محمد زئی میں کاونٹر خان کی ۱۴۰ کنال اور ۲ مرلہ زمین بحق سرکار ضبط کرلی گئی اور اس نے جو ۲۲ کنال زمین رہن رکھی تھی وہ بھی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لی۔[81] اس کے علاوہ حکومت نے کاونٹر خان کی پنشن اور اس کے اعزازات بھی ضبط کرلئے اور اس کے گاؤں کو مسمار کردیا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق کاونٹر خان کے مسمار شدہ گاؤں کی قیمت سات ہزار روپے اور ضبط شدہ املاک کی قیمت پانچ ہزار روپے تھی۔

اگرچہ کاونٹر خان براہ راست مس ایلس کے اغوا میں ملوث نہیں تھا لیکن پھر بھی اس نے مس ایلس کے اغوا کے موقع پر شہزادہ خان کو دودھ اور روٹی فراہم کی تھی اور اسی جرم کی پاداش میں اسے کئی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ ۱۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو حکومت نے درہ آدم خیل کے قبائلی زعماء سے مطالبہ کیا کہ وہ یہ ضمانت فراہم کریں کہ کاونٹر خان اور اس کے بیٹے آئندہ ارتکاب جرم نہیں کریں گے۔ اگرچہ قبائلی ملکوں نے چار ہزار روپے کی ضمانت دی لیکن پھر بھی علاقہ سرکار میں گل خان اور شیر خان کے جانے پر پابندیاں لگادی گیئں۔ آخر ۲۲ ستمبر ۱۹۲۷ء میں انہیں اس شرط پر علاقہ سرکار میں جانے کی اجازت دی گئی کہ وہ دو، دو ہزار روپے فی کس ضمانت فراہم کریں۔[82]

المختصر مس ایلس کے اغوا کے بدلے انگریزوں نے درہ آدم خیل کے آفریدیوں اور اورکزئی قبائل پر ۶۹،۵۰۰ روپے جرمانہ عائد کیا۔ عجب خان، کاونٹر خان اور سلطان کے گھروں کو مسمار کیا اور ان کو ممکنہ حد تک اذیت دی۔

باب ششم

صنعت اسلحہ سازی

قبائل اسلحہ کو زندگی کی قیمتی متاع اور مردانگی کا زیور سمجھتے ہیں وہ اپنی حفاظت کیلئے نہ صرف اسلحہ رکھتے ہیں بلکہ اسلحہ میں خود کفالت کے پیش نظر اسلحہ سازی کے کام میں بھی مصروف رہتے ہیں۔ اسلحہ کے ساتھ آفریدیوں کی والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے پیگٹ اور میسن لکھتے ہیں "وہ مال مویشی چرانے باربرداری کے جانور ہانکنے اور کھیتوں میں ہل چلاتے وقت غیر مسلح نہیں ہوتے -------- اسلحہ کے ساتھ محبت ان کے کردار کا ایک نمایاں پہلو ہے وہ رائفل کے حصول کیلئے ملازمت اختیار کرتے ہیں اور اگر ملازمت کے اختتام پر ایک آفریدی کے پاس اتنی رقم نہ ہو جس سے وہ اسلحہ خرید سکے تو پھر وہ رائفل کے ہمراہ کارتوس لے جانے سے بھی گریز نہیں کرتا"۔

قبائلی علاقے اور خاص طور پر درہ کوہاٹ میں اسلحہ سازی کی صنعت نئی نہیں بلکہ پرانی ہے۔ کرنل میکریگر کے بقول انیسویں صدی عیسوی میں تیراہ (خیبر ایجنسی) میں مرزا خان نامی شخص کے کارخانے میں اچھی ساخت کی تیراہی تلواریں بنائی جاتی تھیں جو ایرانی تلواروں سے کسی لحاظ سے کمتر نہیں تھیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ کوہاٹ عرصہ دراز سے بندوقوں کی اچھی نالیاں بنانے کیلئے مشہور ہے نالیاں کوہاٹ کے قدیم شہر سے ملحقہ دیہات میں جو موجودہ شہر سے تقریباً چھ فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہیں تیار کی جاتی تھیں۔ (آ) یہاں کے کاریگر سارا کام دیسی اوزاروں کی مدد سے کیا کرتے ہیں اگر ان کے

(آ) میکریگر کا اشارہ جنگل خیل کی طرف ہے۔

شکستہ اوزاروں کا مقابلہ یورپ کے کاریگروں کے اعلیٰ سازوسامان اور قیمتی مشینوں سے کیا جائے تو انسان ان کی ذہانت، اعلیٰ فنی مہارت اور کمال فن پر ششدر رہ جاتا ہے۔ ان کے اوزاروں میں مختلف قسم کے ہتھوڑے، چند دیسی ساخت کے زنبور، فولادی ابرن، مٹی کی بھٹی اور بکرے کی کھال کی دھونکنی شامل ہیں۔[1]

تاریخی شواہد کی روشنی میں اسلحہ سازی کا کام پہلے پہل کوہاٹ کے موضع جنگل خیل میں شروع ہوا تھا لیکن اسلحہ ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس صنعت کو دھچکا لگا[2] اور یہاں کے کاریگروں نے منافع بخش کاروبار کی تلاش میں درہ آدم خیل کا رخ کیا۔ (آ) مقامی روایات کے مطابق درہ آدم خیل میں اسلحہ سازی کا کام انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں حسین نامی ایک مقامی کاریگر نے شروع کیا تھا اور یہاں موضع جنگل خیل کے صنوبر، ہمیش گل اور سعید نامی کاریگروں کی آمد سے اس صنعت کو مزید تقویت ملی۔ ڈگلس ڈانلڈ اسی روایت کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ درہ کوہاٹ میں اسلحہ سازی کا کام جنگل خیل کے کاریگروں نے شروع کیا تھا یہ کاریگر سرکاری ورکشاپوں میں بطور مستری کام کر چکے تھے لیکن اسلحہ ایکٹ کے نفاذ کے بعد چونکہ بندوقوں کی مرمت اور تیاری میں منافع کے امکانات کمتر ہو گئے اسلئے وہ درہ آدم خیل چلے آئے۔ حسین نامی شخص جو فیروزپور اور راولپنڈی میں اسلحہ کی تجارت کرتا تھا ان کاریگروں کا سرغنہ تھا۔[3] دوسری طرف ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق درہ میں اسلحہ سازی کا کام محمد بخش نامی کاریگر نے شروع کیا تھا جو اس سے قبل افغانستان کی ورکشاپوں میں مستری رہ چکا تھا۔ اس

(آ) ۱۸۸۳ء میں اسلحہ کی مرمت اور فروخت کے لائسنس ان لوگوں کے دیئے گئے جنہوں نے ۱۸۸۲ء میں ۱۳ بندوق اور ۲۳ پستول مرمت کئے تھے۔

نے درہ آدم خیل میں اپنے قیام کے دوران بیشتر کاریگروں کو اسلحہ سازی کا کام سکھایا اور پھر ۱۹۰۱ء میں ناوا گئی چلا گیا جہاں اس نے سو (۱۰۰) کاریگروں پر مشتمل اسلحہ سازی کا ایک ورکشاپ قائم کیا۔[4]

۱۹۰۱ء میں درہ کوہاٹ میں ناکارہ قرار دی ہوئی سرکاری بندوقوں کے پرزے جوڑنے سے بندوقیں بنائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مقامی کاریگر اپنے شکستہ اوزاروں کی مدد سے دیسی اسلحہ بھی تیار کیا کرتے تھے اس کی تصدیق برطانیہ کے انجہانی وزیراعظم سرونسٹن چرچل (آ) کی اس تحریر سے ہوتی ہے کہ ۱۸۹۷ء کی جنگ ملاکنڈ کے اختتام پر اتمان خیل قبائل نے حکومت کو جو سو بندوقیں پیش کی تھیں ان کا ایک تہائی حصہ ایسے از کار رفتہ مارٹنی ہنری بندوقوں پر مشتمل تھا جن پر سرکاری مہر ثبت تھی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ سرکاری احکامات کے مطابق ناکارہ اور ناقابل استعمال بندوقوں کے تین ٹکڑے کئے جاتے تھے لیکن مجھے ایسے کئی پرزے دکھائے گئے جو قبائل نے دوبارہ جوڑ لئے تھے۔[5]

۱۹۰۲ء میں درہ کوہاٹ میں خانی میلہ (حال فیروز خان کلی) شیرین میلہ (حال ٹنڈی کلی) زڑہ میلہ اور کاریگر میلہ میں اسلحہ سازی کے چار کارخانے تھے۔ خانی میلہ میں موضع جنگل خیل کے سعید اور ہمیش گل، شیرین میلہ میں کالا باغ کے چار کاریگر اور زڑہ میلہ اور کاریگر میلہ میں مقامی کاریگر خان شیر اور حسین کے زیر نگرانی مارٹنی مٹفورڈ اور ماٹنی ہنری بندوقیں تیار کرتے تھے۔ ان کارخانوں کی ماہوار پیداواری صلاحیت ساٹھ بندوقیں تھیں۔[6] ان کاریگروں میں سعید اور ہمیش گل اعلیٰ قسم کی بندوقیں بنانے کیلئے مشہور

(آ) سرونسٹن چرچل نے ۱۸۹۷ء کے جنگ ملاکنڈ میں حصہ لیا تھا۔ چکدرہ کے قریب ایک چوکی ان کے نام پر موسوم کی گئی ہے جو اب بھی چرچل پیکٹ کے نام سے مشہور ہے۔

تھے اور انہی کی بدولت درہ میں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ کالاباغ کے میاں علی محمد (آ) اور وارث خان نے بھی اس صنعت کو پروان چڑھانے میں مدد دی اور مشینوں کے ذریعے بولٹ اور نالی تیار کرکے آدم خیل کے کاریگروں کا کام سہل اور آسان بنایا۔

جوں جوں درہ آدم خیل میں اسلحہ سازی کی صنعت ترقی کرتی گئی حکومت کو تشویش لاحق ہونے لگی۔ صوبہ سرحد کے چیف کمشنر کرنل ڈین نے ۱۹۰۲ء میں درہ آدم خیل میں تیار شدہ دیسی ساخت کی دو بندوقیں مرکزی حکومت کو بھجوائیں۔ انہوں نے ہندوستان کے امور خارجہ کے سکرٹری کے نام اپنے خط میں لکھا کہ "اسلحہ سازی کی صنعت نے جو ترقی کی ہے وہ ان بندوقوں سے ظاہر ہوتی ہے---- لیکن میرے خیال میں ان کو میگزین کے سپرنگ بنانے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں اور اسلئے وہ سرکاری بندوقوں سے سپرنگ چرانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ درہ کی صنعت اسلحہ سازی کی ترقی محمد بخش کی مرہون منت ہے جو اس سے قبل کابل کی ورکشاپوں میں بطور مستری کام کر چکا ہے۔" انہوں نے مزید لکھا "یہ بندوقیں درے کے کاریگروں نے خود ہی تیار کی ہیں اور یہ اسلحہ از کار رفتہ بندوقوں کے پرزوں سے بنے ہوئے اسلحہ سے زیادہ عمدہ ہے[۷]۔" حکومت نے چیف کمشنر کی رپورٹ کی روشنی میں درہ آدم خیل کے کاریگروں کے اسلحہ سازی کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے اور ان کے آلات وغیرہ کے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کی غرض سے ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء کو کالو نامی ایک سرکاری مستری کو درہ آدم خیل بھیجا۔ کالو نے اپنی رپورٹ میں اس امر کی تصدیق کی کہ خراد کی مشین کے بعض پرزوں کے علاوہ درہ کے کاریگر دیسی سازوسامان کی مدد سے اسلحہ تیار کرتے ہیں[۸]۔

(آ) میاں علی محمد کے پوتے (عبدالغفور کے بیٹے) کچھ عرصہ موضع ٹنڈی اور بعد میں میلہ فیروز خان میں مقیم رہے۔ وہ بہترین قسم کے بولٹ بنانے کیلئے مشہور تھے

۱۹۰۶ء تک درہ آدم خیل میں اسلحہ سازی کی صنعت روبہ ترقی تھی لیکن اسی سال خلیج فارس سے زیادہ مقدار میں مارٹنی ہنری اور بندری نامی بندوقوں کی درآمد سے دیسی اسلحہ کی مانگ کم ہوگئی[۹] اور اسلئے درہ میں دیسی اسلحہ کی تجارت ماند پڑ گئی۔ چونکہ انگریز یہ بات گوارا نہیں کرسکتے تھے کہ قبائل اعلیٰ قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہوں اسلئے انہوں نے خلیج فارس سے مارٹنی ہنری بندوقوں کی سمگلنگ کے خلاف اقدامات کئے لیکن اس کے باوجود درہ میں مارٹنی ہنری بندوقوں کی تجارت جاری رہی۔ اس قسم کی بندوقیں قبائلی علاقہ میں زیادہ پسند کی جاتی تھیں اسلئے درہ کے کاریگروں نے بھی ویسی ہی بندوقیں تیار کرنی شروع کیں[۱۰]۔

یہاں ان حالات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا جن کی وجہ سے درہ میں صنعت اسلحہ سازی کو سنگین بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آواخر میں خلیج فارس سے وسیع پیمانہ پر اسلحہ کی سمگلنگ شروع ہوئی اور ۱۸۹۷ء کی جنگ سرحد میں انگریزوں پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ قبائل کے پاس انگریزی ساخت کا کافی اسلحہ موجود ہے چونکہ جدید اسلحہ سے قبائل کا لیس ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا اسلئے حکومت نے جولائی ۱۸۹۸ء میں پنجاب کے پولیس کے انسپکٹر جنرل کرنل ٹکر اور اسسٹنٹ ایڈ جوٹنٹ جنرل کرنل ڈبلیوبل کی سرکردگی میں دیسی ساخت کے اسلحہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی قائم کی جس نے ۱۸ اپریل ۱۸۹۹ء کو حکومت کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ اسلحہ کی تجارت کا دائرہ جنوب میں چترال اور گلگت کی ایجنسیوں سے لے کر درہ گومل تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے اندازے کے مطابق ان علاقوں کے ساڑھے بارہ لاکھ باشندوں کے پاس اڑتالیس (۴۸) ہزار بندوقیں تھیں ان میں ۷،۷۰۰ بریچ لوڈنگ بندوقیں بھی شامل تھیں۔ یہ بندوقیں یا تو فوج سے چرائی گئی تھیں اور یا ان بندوقوں کے پرزوں سے تیار کی گئی تھیں جو ناکارہ ہونے کے بعد ورکشاپوں میں جمع کرائی گئی تھیں۔ ان میں ایسی بندوقیں بھی شامل

تھیں جو کابل میں بنائی گئی تھیں اور بعض بندوقیں ہندوستان اور خلیج فارس کے راستے قبائلی علاقے میں پہنچائی گئی تھیں۔[۱۱]

کارتوسوں کے متعلق انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان میں کچھ انگریزی، کچھ کابلی اور کچھ ایسے کارتوس شامل ہیں جو ایک دفعہ استعمال ہونے کے بعد دوبارہ بھر لئے گئے ہیں۔ ان کے اندازے کے مطابق ۱۸۹۷ء میں ۲۳،۹۵،۴۲۵ کارتوس مانچسٹر کی بندرگاہ سے خلیج فارس تک پہنچائے گئے تھے۔ کمیٹی نے حکومت کو سفارش کی کہ ۵۷۷ اور ۴۵۰ قسم کے کارتوسوں کی درآمد بند کی جائے اور خلیج فارس کے راستے اسلحہ کی سمگلنگ بند کروانے کیلئے موثر اقدامات کئے جائیں۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ تھری ناٹ تھری قسم کی بندوقوں کی درآمد پر پابندیاں عائد کی جائیں۔ جو بندوقیں استعمال کے بعد ناکارہ ہو جائیں وہ نیلام کرنے کی بجائے ضائع کر دی جائیں اور سرحد کے لوگوں کو بندوقیں بطور تحفہ نہ دی جائیں۔ حکومت نے ۱۸۹۷ء سے ۱۹۱۰ء تک خلیج فارس سے اسلحہ کی غیر قانونی تجارت بند کرنے کیلئے ٹھوس اقدامات کئے اسی سلسلہ میں ایران، کویت، اومان، مسقط، دوبئی اور خلیج فارس کے دیگر ممالک سے معاہدے کئے گئے۔ ۱۸۹۷ء میں اسلحہ کی سمگلنگ کے روک تھام کے سلسلہ میں ایرانی حکومت اپنے جہازوں کی تلاشی لینے پر آمادہ ہوئی[۱۲] اسی طرح سلطان مسقط نے بھی ایک معاہدے کے تحت اپنے علاقے میں اسلحہ کی غیر قانونی تجارت کی بندش اور اپنی سمندری حدود میں انگریزوں کو جہازوں کی تلاشی لینے کی اجازت دی۔ ایسے ہی انتظامات کویت اور بحرین کے حکام کے ساتھ بھی کئے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں انگریزوں نے دوبئی، اجمان، ام القین اور ابوظہبی کے حاکموں کے ساتھ اسلحہ کی تجارت کے متعلق معاہدے کئے اور اسی مقصد کیلئے بندر عباس میں ایک برٹش وائس کونسل مقرر کیا گیا لیکن ان تمام اقدامات کے باوجود بھی اسلحہ کی سمگلنگ جاری رہی۔[۱۳]

۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی عرصہ میں یورپ کی بنی ہوئی ۱۳۸۳۱ بندوقیں مسقط سے صوبہ سرحد

پہنچائی گیئں۔ ۱۹۰۲ء کے آغاز میں مسقط، جاسک، بندر عباس اور اجرہ میں اسلحہ کی منڈیاں کھولی گیئں۔ حاجی امین جس کا اصلی نام محمد حسین گلاداری امانت تجار تھا، بندر عباس میں اسلحہ کا سب سے بڑا سوداگر تھا مسقط میں اس کے ہم زلف سید یوسف اور اس کا بیٹا عبدالقادر اس کے ایجنٹ تھے۔۔ علاوہ ازایں عبداللہ بن علی قاسم نامی ایک عرب اور رتنسی پاریشوم بھاٹیہ نامی ایک ہندو بھی مسقط میں اسلحہ کے تاجر تھے۔[۱۴] سمگل شدہ بندوقیں سمندری جہازوں کے ذریعے بندر عباس تک اور وہاں سے افغانستان اور صوبہ سرحد تک پہنچائی جاتی تھیں۔ خراسان اور افغانستان کے پاوندے اور خاص طور پر میاں خیل دوتانی اور نیازی قبائل اسلحہ کے تاجر تھے۔ پاوندے اکثر اپریل اور مئی کے دوران کراچی سے بذریعہ جہاز بندر عباس جایا کرتے تھے۔ خلیج فارس سے زیادہ مقدار میں اسلحہ درآمد کرنے کی وجہ سے درہ میں بندوقوں کی قیمتیں گرنی شروع ہو گیئں اور اس سے دیسی اسلحہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسقط میں اس وقت ایک مارٹنی بندوق کی قیمت بمعہ ۲۰ کارتوس ۶۰ اور ۸۰ ڈالر کے درمیان تھی۔

۱۹۰۷ء میں حکومت کو جو رپورٹیں موصول ہوئی تھیں ان کے مطابق بلوچستان اور افغانستان کے راستے قبائلی علاقے میں اسلحہ پہنچایا جاتا تھا۔ جولائی ۱۹۰۷ء میں بندر عباس سے ۵۰۰ بندوقیں افغانستان لائی گیئں ان میں سے ہر ایک بندوق ۲۵۰ روپے میں فروخت کی گئی۔ آواخر اگست میں وہاں آٹھ ہزار بندوقیں فروخت کیلئے موجود تھیں ان بندوقوں پر NSW/MR یا NSW/E یا NSW کے نشان موجود تھے اور یہ بندری بندوقوں کے نام سے یاد کی جاتی تھیں۔ ان کی درآمد سے درہ میں اسلحہ سازی کی صنعت کو سخت دھچکا لگا اور درہ کوہاٹ کے اکثر قبائل نے اسلحہ سازی کی بجائے یورپی اسلحہ کی منافعت بخش تجارت شروع کر دی۔[۱۵]

اس وقت ایک ڈالر کی قیمت ایک روپیہ پانچ آنے تھی۔

شروع شروع میں آدم خیل خلیج فارس کے سوداگروں کے ساتھ اسلحہ کی تجارت غلزئی قبائل کی وساطت سے کرتے تھے مگر بندری قسم بندوقوں کی درآمد کے ساتھ ہی انہوں نے مسقط اور خلیج فارس کے سوداگروں کے ساتھ براہ راست تجارت شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگست ۱۹۰۸ء میں درہ کے اخوروال آفریدی اپنے ساتھ ۳۰۰ بندوقیں اور پستول اور پچاس ہزار کارتوس لے آئے۔ ستمبر ۱۹۰۸ء میں آدم خیل تاجروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ کراچی آئے اور وہاں سے فقیروں کے لباس میں مسقط پہنچ گئے یہ لوگ وہاں سے ایک ہزار بندوقیں اور ۱۲۰ پستول لانے میں کامیاب ہوگئے[16]۔ اسی سال آدم خیل تاجر اپنے ساتھ ۴۰۰ بندری بندوقیں اور کافی کچھ کارتوس لائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ۲۴۰۰ بریچ لوڈر بندوقیں درہ کوہاٹ پہنچائی گیئں جو ناوا کی تاجدار، ناوا کی لنڈی اور ناوا کی بندری کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں سے ایک قسم بندری بندوقوں پر "ماشاء اللہ" کا نشان اور دوسرے پر روپیہ کا نشان تھا جسے "کلدار چھاپ" کہا جاتا تھا۔ یہ بندوقیں انگلستان میں نہیں بلکہ دیگر ممالک میں تیار کی گئی تھیں اور مندرجہ ذیل قیمتوں پر دستیاب تھیں[17]۔

(۱) ناوا کی تاجدار بغیر کارتوس ---------------- ۲۸۰ روپے

(۲) ناوا کی تاجدار بمعہ ۵۰ کارتوس ---------------- ۴۰۰ روپے

(۳) ناوا کی لنڈی بغیر کارتوس ---------------- ۴۰۰ روپے

(۴) ناوا کی لنڈی بمعہ ۵۰ کارتوس ---------------- ۵۰۰ روپے

(۵) ناوا کی بندری بغیر کارتوس ---------------- ۱۲۰ روپے

(۶) ناوا کی بندری بمعہ ۳۰ کارتوس ---------------- ۱۴۰ روپے

۱۹۰۷ء میں قبائلی علاقہ کو پندرہ ہزار اور ۱۹۰۹ء میں چالیس ہزار مارٹنی ہنری بندوقیں درآمد کی گیئں اور اتنی مقدار میں بندوقوں کی درآمد سے مارٹنی ہنری بندوقوں کی قیمتیں گرنی شروع ہو گیئں۔

اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ سال ۱۹۰۶ء میں ایک مارٹنی ہنری بندوق کی قیمت ۵۰۰ روپے تھی لیکن ۱۹۰۸ء میں اس کی قیمت گھٹ کر ۱۳۰ روپے ہوگئی۔ جولائی ۱۹۰۹ء میں آدم خیل آفریدیوں کا سو افراد پر مشتمل ایک کارواں اسلحہ سے لدے ہوئے ۱۳۰ اونٹوں کے ساتھ کابل پہنچ گیا اور اپنے ساتھ ۵۰۰ بندقیں لے آیا۔ ان میں ۷۰ فیصد مارٹنی اور ۳۰ فیصد تھری ناٹ تھری قسم کی بندوقیں شامل تھیں۔ آدم خیل اپنے ساتھ ماوزر قسم کے ۲۰۰ پستول لائے تھے اور ایک پستول کی قیمت بمعہ دس پیکٹ کارتوس دو سو روپے تھی[18]۔ اسلحہ کے سمگلروں کے حرکات وسکنات سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا مشکل تھا کیونکہ قومی جرگے کے فیصلے کے مطابق مخبر سے نہ صرف دو ہزار روپے جرمانہ وصول کیا جاتا تھا بلکہ اس کا گھر بھی جلادیا جاتا تھا۔

اگست ۱۹۰۹ء میں حسن خیل (آدم خیل) کے میروس نامی شخص نے اسلحہ کی تجارت کیلئے ۴۸ ہزار روپے جمع کئے اور اس کاروبار میں آدم خیل آفریدیوں نے کافی منافع کمایا[19] لیکن ستمبر ۱۹۰۹ء میں انگریزوں نے اپنے بحری بیڑے کی مدد سے اسلحہ کی تجارت بند کرنے کیلئے اقدامات کئے اور عرب ممالک اور ایران کی طرف سے آنے والے جہازوں کی تلاشی لینی شروع کردی۔ اگست ۱۹۱۰ء میں بندر عباس سے واپسی پر آدم خیل آفریدیوں کا زیادہ اسلحہ راستے میں پکڑا گیا اور جو اسلحہ ان کے پاس تھا وہ بھی گرفتاری کی خوف سے انہوں نے سمندر میں پھینک دیا جس سے ان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اس بحری ناکہ بندی پر اگست ۱۹۱۴ء تک سختی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا رہا جس کے نتیجہ میں مسقط میں یورپی فرمیں اپنی اسلحہ کی دوکانیں بند کرنے پر مجبور ہوگیئں[20] اور بالآخر حکومت کو اسلحہ کا یہ ناجائز کاروبار مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ کئی مقامات پر اسلحہ کی بڑی کھیپیں پکڑی گیئں اور غن قبائل کی دولت خلیج فارس کے اسلحہ ڈیلروں کے پاس رہ گئی ان قبائل میں سے آدم خیل اور خیل آفریدیوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق آدم خیل آفریدیوں کو

اس طرح ایک لاکھ تیس ہزار روپے کا نقصان ہوا اس میں سے اخوروال کا نقصان ساٹھ ہزار روپے، شیراکی کا چالیس ہزار روپے، حسن خیل اور آشو خیل کا بیس ہزار روپے، زرغن خیل کا آٹھ ہزار روپے اور بوستی خیل کا نقصان دو ہزار روپے تھا۔ جواکی قبائل کے نقصان کا اندازہ بیس ہزار روپے اور خیبر کے آفریدیوں کے نقصان کا تخمینہ چودہ ہزار روپے لگایا گیا تھا۔[21]

درہ آدم خیل کے قبائل میں آخور اور شیراکی کے تاجر سب سے زیادہ متاثر ہوئے انہوں نے حکومت کے اس اقدام پر برہمی کا اظہار کیا اسے یکطرفہ کاروائی سمجھتے ہوئے انہوں نے ۲ ستمبر ۱۹۱۰ء کو اخوروال کی حدود میں ڈاک لے جانے والے ایک سرکاری تانگے پر حملہ کیا اور اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ اس وقت تک درہ کوہاٹ پر نقل و حمل کی اجازت نہیں دیں گے جب تک ان کی شکایات کا ازالہ نہ کیا جائے۔[22] چونکہ اس تانگہ میں کوئی انگریز سوار نہیں تھا اسلئے انہوں نے کوچوان کو تنبیہ دی کہ وہ انگریزوں کو اس سڑک پر نہیں لے جائیں گے۔ آدم خیل قبائل کے اس اشتعال انگیز روئیے کی بنا پر درہ کوہاٹ کی سڑک پر آمدورفت معطل کردی گئی درہ کی سڑک پر آمدورفت بحال کرنے کے سلسلہ میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر نے ۱۵ ستمبر ۱۹۱۰ء کو درہ آدم خیل کے ایک قبائلی جرگہ سے ملاقات کی لیکن جرگے نے مالی نقصانات کے پیش نظر حکومت سے نقصانات کی تلافی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے واشگاف الفاظ میں نہیں بتایا تھا کہ خلیج فارس کے ساتھ اسلحہ کی تجارت پر پابندی لگائی گئی تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ اسلحہ کی تجارت ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھی اور وہ حکومت سے اس سلوک کی ہرگز توقع نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اس کاروائی کو غیر قانونی سمجھتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ یہ کاروائی ایک ایسے ملک میں کی گئی ہے جہاں انگریز کو مداخلت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مزید برآں درہ کے سوداگر سرکاری علاقہ میں نہیں بلکہ افغانستان اور ایران کے راستے خلیج فارس کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔[23] انگریزوں کی مخصوص حکمت عملی کے تحت ڈپٹی کمشنر نے ان کے ساتھ روایتی ہمدردی کا

اظہار تو کیا لیکن کسی قسم کی مالی مدد یا ان کے مالی نقصانات کی تلافی کا وعدہ نہیں کیا۔ اس کے دوسرے روز یعنی ۱۶ ستمبر کو جرگے نے صوبہ سرحد کے چیف کمشنر مسٹر مرک سے ملاقات کی لیکن چیف کمشنر جرگے کے ساتھ سختی سے پیش آیا اور انہیں کہا کہ حکومت ان کے نقصانات کی ذمہ دار نہیں کیونکہ حکومت کئی دفعہ ان کو تنبیہ کر چکی ہے کہ وہ خلیج فارس کے ساتھ اسلحہ کی غیر قانونی تجارت بند کردیں۔ اسی سلسلہ میں ان کے بعض افراد گرفتار کئے گئے تھے اور بعض افراد گرفتاری کے بعد مسقط اور کراچی واپس کردئے گئے تھے۔ چیف کمشنر نے واضح کیا کہ خلیج فارس میں اسلحہ کا کاروبار صریحاً ناجائز تھا اور نہ صرف قبائل بلکہ ساری دنیا اس حقیقت سے واقف تھی۔[24] چیف کمشنر کے تیز و تند لہجے پر قبائلی زعماء مزید برہم ہوئے اور انہوں نے درہ کی سڑک بند رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا لیکن ۲۲ ستمبر کو یہ سڑک چیف کمشنر کی اس یقین دہانی کے بعد آمدورفت کیلئے کھول دی گئی کہ اگر حکومت نے متاثرہ افراد کی امداد کا فیصلہ کیا تو پھر تمام متاثرہ افراد کو مالی مدد دی جائیگی۔[25]

یورپی اسلحہ کی تجارت میں جہاں درہ آدم خیل کے قبائل کو نقصان اٹھانا پڑا وہاں درہ آدم خیل میں دم گھٹتی ہوئی اسلحہ سازی کی صنعت کو نئی زندگی ملی۔ اسلحہ کی سمگلنگ بند ہونے کے ساتھ ہی دیسی اسلحہ کی مانگ بڑھ گئی اور ساٹھ روپے کے بندوق کی قیمت ڈیڑھ سو روپے تک پہنچ گئی اسلئے مقامی کاریگروں نے اپنی تمام تر توجہ اسلحہ سازی پر مرکوز کردی۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں وزیرستان، مہمند اور ملاکنڈ ایجنسی کے قبائل نے درے کا بنا ہوا اسلحہ زیادہ مقدار میں خریدا۔ اگرچہ یہ بندوقیں شکل وصورت کے لحاظ سے زیادہ عمدہ دکھائی نہیں دیتی تھیں لیکن پھر بھی ان کی گولی کی مار ۸۰۰ اور ایک ہزار گز کے درمیان تھی۔[26] ۱۹۱۱ء میں مختلف قسم کی بندوقوں کی قیمتوں میں ۲۰ سے ۴۰ فیصد تک اضافہ ہوا اسی دوران درہ کوہاٹ کے کاریگروں نے بندوق سازی میں مزید مہارت حاصل کی۔ دیسی اسلحہ کے معیار میں بہتری کا ذکر کرتے ہوئے چیف کمشنر نے جون ۱۹۱۳ء میں لکھا کہ مارٹنی ہنری بندوقوں کی بناوٹ بہتر بنانے کے

ساتھ ساتھ بندوقوں کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان بھی جاری ہے کیونکہ خلیج فارس سے اسلحہ کی بندش کی وجہ سے مارٹنی ہنری کی مانگ زیادہ ہوگئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موسم سرما میں افغانستان کے کوچی درہ کی بنی ہوئی ایک ہزار مارٹنی ہنری بندوقیں اپنے ساتھ افغانستان کے مغربی علاقے میں لے گئے ہیں

۱۹۱۱ء میں درہ میں اسلحہ سازی کے نصف درجن کارخانے تھے اگرچہ درہ کے کاریگروں کو بولٹ اور نالی بنانے میں دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن پھر بھی وہ عمدہ اسلحہ تیار کیا کرتے تھے[۲۷]۔ خلیج فارس سے اسلحہ کی بندش کے بعد انگریزوں نے درہ میں اسلحہ کی پھلتی پھولتی صنعت پر کاری ضرب لگانے کے منصوبے بنانے شروع کئے اور ان کے یہ عزائم اس وقت کھل کر سامنے آئے جب ۱۹۱۱ء میں حکومت نے درہ آدم خیل کے کارخانے بند کرنے کی ایک تجویز پر غور شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر کو ضروری ہدایت دی گئی لیکن چیف کمشنر نے اس فیصلے سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے یقین ظاہر کیا کہ درہ کے لوگ اس تجویز کی مخالفت کریں گے اور ہوسکتا ہے کہ طاقت استعمال کرنے کی صورت میں یہ کارخانے ایسے مقامات پر منتقل ہو جائیں جہاں ان پر نظر رکھنا بھی مشکل ہو گا[۲۸]۔ چیف کمشنر کے نقطہ نظر کو قبول کرتے ہوئے حکومت نے اس فیصلے پر عملدرآمد ملتوی کردیا لیکن پھر بھی اسلحہ کی صنعت کی حوصلہ شکنی کیلئے اپنی کوششیں بدستور جاری رکھیں۔

درہ کے بنے ہوئے اسلحہ میں خوست کے قبائل کی دلچسپی کی بنا پر ۱۴-۱۹۱۲ء میں دیسی بندوقوں کی مانگ مزید بڑھ گئی۔ خوست کے قبائل اس اسلحہ کو خلیج فارس میں یورپی بندوقوں کے ساتھ ملا کر زیادہ قیمت پر فروخت کیا کرتے تھے[۲۹]۔ دیسی اسلحہ کی بڑھتی ہوئی مانگ اور اس صنعت کی حوصلہ شکنی کی غرض سے حکومت نے ۱۶-۱۹۱۵ء میں درہ آدم خیل کو لوہا، تانبہ اور فولاد لے جانے پر پابندیاں عائد کیں ان اقدامات سے نتیجہ میں لوہے کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہوا اور مئی، جون ۱۹۱۸ء کے دوران ایک من لوہے کی قیمت ۰۰ تا ۸۰ روپے تک پہنچ گئی لیکن لوہے کی مہنگائی کے باوجود بھی درہ میں اسلحہ کی

پیداوار میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی اور ۱۸-۱۹۱۷ء کے دوران درہ میں دو ہزار تین سو (۲۳۰۰) اور ۱۹-۱۹۱۸ء میں ۲۹۰۸ بندوقیں فروخت کی گئیں[۳۰]۔ حکومت نے فرانیٹر کرائمز ریگولیشن کے تحت اضلاع سے قبائلی علاقوں میں کاریگروں کے جانے پر بھی پابندیاں عائد کردیں۔

۱۹۲۲ء میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کرنل بروس نے درہ میں اسلحہ سازی کے کارخانے بند کرنے کی تجویز پیش کی مگر چیف کمشنر اس تجویز سے متفق نہیں ہوئے البتہ انہوں نے پنجاب فرانٹیر کرائمز ریگولیشن ۱۸۷۳ء کے تحت علاقہ سرکار سے قبائلی علاقہ میں تربیت یافتہ مستریوں کے جانے پر پابندیاں لگانے کی ہدایت کی[۳۱]۔ پہلی جنگ عظیم، افغانستان کی تیسری لڑائی، تحریک جدوجہد آزادی، رولٹ ایکٹ کی مخالفت اور ہجرت اور خلافت کی تحریکوں کے ساتھ ہی سرحد کے لوگوں نے وسیع پیمانہ پر دیسی اسلحہ خریدنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ حکومت نے لوگوں کو اپنی حفاظت کیلئے پاس کے ذریعے اسلحہ خریدنے کی اجازت دے دی یہ پاس بعد میں اسلحہ کی سمگلنگ کا ذریعہ بن گئے جن سے اسلحہ کے تاجروں کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ ان پاسوں کی ایک خامی یہ تھی کہ ان کے ذریعے ایک سے زائد مرتبہ اسلحہ لے جایا جاسکتا تھا کیونکہ پاسوں کے ذریعے لے جائے جانے والے اسلحہ کے اندراج کیلئے نہ کوئی رجسٹر تھا اور نہ خرید شدہ اسلحہ پر کوئی نشان لگایا جاتا تھا اسلئے ایک پاس پر ایک شخص کئی دفعہ اسلحہ لے جاسکتا تھا[۳۲]۔

اسلحہ سازی کے ساتھ ساتھ درہ کے بعض کاریگروں نے ۱۹۲۵ء میں افغانستان کے جعلی سکے بھی بنانے شروع کئے۔ اسی سلسلہ میں حکومت نے زرغون خیل کا ایک جرگہ بلایا جس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اگر کوئی شخص جعلی سکے بنانے کے جرم کا مرتکب پایا گیا تو اس سے پہلی دفعہ ارتکاب جرم پر سو روپے جرمانہ اور دوسری دفعہ پانچ سو روپے جرمانہ وصول کیا جائیگا۔ اس قسم کا معاہدہ درہ آدم خیل کے باقی قبائل کے ساتھ بھی کیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں درہ کے تین افراد کو جعلی سکوں کے الزام میں جرمانہ کیا گیا اور ۲۷ مشتبہ افراد کو پانچ پانچ سو روپے کی ضمانت کا پابند بنایا گیا[۳۳]۔ جون ۱۹۲۶ء میں درہ کے آفریدیوں کے ساتھ

ایک معاہدہ کیا گیا جس کے تحت بموں کی تیاری اور بموں کی تجارت ممنوع قرار دے دی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ بموں کی تجارت میں ملوث افراد سے چار سو روپے جرمانہ وصول کیا جائیگا جس سے نصف رقم سرکاری خزانہ میں جمع کی جائیگی اور باقی ماندہ رقم متعلقہ قبیلے کے لوگوں میں تقسیم کی جائیگی۔[۳۴]

۱۹۲۹ء میں افغانستان میں سیاسی خلفشار کے نتیجہ میں درہ میں اسلحہ کی مانگ بڑھ گئی اسلئے چیف کمشنر نے اسلحہ کی تجارت کو محدود کرنے کیلئے ڈپٹی کمشنر کو ضروری ہدایات جاری کیں۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ اسلحہ کے کاروبار کا خاتمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ فی الحال پنجابی مستریوں کے خلاف فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن یا سیکیورٹی ریگولیشن کی دفعہ ۳۶ کے تحت کاروائی کی جائے جو درہ میں اسلحہ سازی کے کام میں مصروف ہیں[۳۵] لیکن ڈپٹی کمشنر نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ پنجابی مستریوں کے نکالنے کے باوجود بھی درہ میں اسلحہ سازی کی صنعت متاثر نہیں ہو گی کیونکہ درہ میں گو نصف کاریگر پنجابی ہیں تاہم اب تک کئی مقامی افراد اسلحہ سازی کا کام سیکھ چکے ہیں اسلئے بہتر حل یہی ہو گا کہ لوہے اور اسلحہ سازی کے سامان پر پابندیاں مزید سخت کی جائیں۔ لوہے کی سلاخیں صرف لائسنس کے ذریعے فروخت کی جائیں اور بازید خیل، ٹل اور پشاور کی سرحد پر فرنٹیئر کنسٹبلری یا لیویز کے دستے تعینات کئے جائیں۔

۱۹۳۰ء میں درہ میں نئی قسم کی بندوقیں تیار ہونے لگیں جو "دوہ فٹی" (دوفٹ لمبی) کے نام سے مشہور تھیں۔ اگست ۱۹۳۱ء میں ایمل چبوترہ (سپینہ تھانڑہ) چیک پوسٹ پر موضع کالو خان کے دو کاریگروں کے قبضہ سے دو نئی قسم کی بندوقیں برآمد کی گئیں ان بندوقوں کی نالی بٹ سے جدا ہو سکتی تھی جس کے بعد ان کی لمبائی دو فٹ رہ جاتی تھی۔ اس قسم کی ایک بندوق کی قیمت ۲۰ روپے تھی چونکہ ایسی بندوقیں آسانی کے ساتھ چوری چھپے پھرائی جا سکتی تھیں اسلئے حکومت نے اس قسم کی بندوقیں بنانے پر پابندی عائد کرنے کے سلسلہ میں ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو ایک جرگہ بلایا جو اس بات پر آمادہ ہوا کہ آئندہ درہ میں ایسی بندوقیں نہیں بنائی جائیں گی اور اگر کسی نے اس معاہدے کی خلاف ورزی

کی تو اس سے سو روپے جرمانہ وصول کیا جائیگا۔ اس رقم میں سے پچاس روپے حکومت کو اور پچاس روپے متعلقہ قبیلے کو دیئے جائیں گے۔[۳۶]

۱۹۳۵ء کے آواخر میں درہ میں اسلحہ کی قیمتوں میں خاصی کمی واقع ہوئی اسلئے صوبہ سرحد کے گورنر سر ریلے گریفتھ نے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کو لکھا کہ اگر درہ آدم خیل میں اسلحہ کی قیمتوں میں واقعی کمی واقع ہوئی ہے تو وہاں کے قبائل کے مواجب میں اس شرط پر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اسلحہ سازی کا کام ترک کر دیں۔ ڈپٹی کمشنر نے اسلحہ سازی کے کام کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ اس وقت درہ میں ۲۴۸ کاریگر اسلحہ سازی میں مصروف ہیں جن میں سے ۲۵ کا تعلق اضلاع سے ہے۔ یہاں مہینہ بھر میں تقریباً ۱۶۰ بندوقیں تیار ہوتی ہیں اور اس وقت ایک بندوق کی قیمت تیس اور چالیس روپے کے درمیان ہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ اسلحہ کی قیمتوں میں کمی اسلئے واقع ہوئی ہے کہ دیسی ساخت کے اسلحہ کے مقابلہ میں لوگ یورپی ساخت کا اسلحہ زیادہ پسند کرتے ہیں اور اگر حالات جوں کے توں رہے تو یہ صنعت اپنی موت آپ مر جائیگی۔[۳۷]

۱۹۳۷ء میں مرکزی حکومت نے درہ میں اسلحہ سازی کے کارخانے بند کرنے کی ایک تجویز پر غور شروع کیا اسی سلسلہ میں ۱۴ جولائی ۱۹۳۷ء کو شملہ میں وائسرائے ہند کی صدارت میں اعلیٰ سطح کا ایک

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ۱۹۳۳ء میں گاؤں فیروز خان میں رفیع الدین اور سید حسن، گاؤں ٹنڈی میں عبدالغفور، میری خیل میں رحمت اللہ، رمضان اور صدیق پنجابی، باور میلہ میں محمد دین اور جان محمد پنجابی، مانی کلی میں خان محمد پنجابی اور ملک سمند خان کے کارخانہ میں غلام نور اور کالو خان کام کرتے تھے۔ ان سب کا تعلق پشاور، کوہاٹ اور پنجاب کے مختلف اضلاع سے تھا۔

اجلاس منعقد ہوا جس میں درہ کوہاٹ، عالم گودر اور جمرود میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایگزیکٹیو کونسل نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی اور پھر جنرل سٹاف نے یہ سفارش کی کہ اس فیصلے کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے[۳۸] لیکن ناگزیر حالات کے پیش نظر اس فیصلے پر فوری عملدر آمد نہ ہو سکا۔ صوبہ سرحد کے گورنر سر جارج کنگھم نے اسی سلسلہ میں درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے امور خارجہ کے سکرٹری او برائے مٹکاف کو لکھا "میں نے اب تک درہ میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کو بند کرنے کے متعلق کوئی قدم نہیں اٹھایا کیونکہ مشکلات زیادہ ہیں اور جب تک ہمیں وزیرستان میں مشکلات درپیش ہیں میں یہ معاملہ چھیڑنا حکومت کے مفاد میں نہیں سمجھتا اور اگر صوبہ سرحد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حالات موزوں اور مناسب ہوں تو پھر بھی اسی سلسلہ میں نہایت احتیاط اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے[۳۹]۔ گورنر سرحد نے یہ تجویز پیش کی کہ طاقت کے استعمال کے ذریعے کارخانے بند کروانے سے بہتر یہ ہو گا کہ درہ کے کارخانہ داروں اور ان کے کاریگروں کو مناسب معاوضہ دیا جائے۔ اسی سلسلہ میں انہیں سالانہ الاؤنس ادا کیا جائے اور دوبارہ کام شروع کرنے کی صورت میں یہ الاؤنس بند کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے قبائل کی اقتصادی بحالی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ کارخانوں کی خرید کی صورت میں ان لوگوں کیلئے ملازمت کا متبادل انتظام کیا جائے۔ انہوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ طاقت استعمال کرنے کی صورت میں درہ کے کاریگر اپنے کارخانے تیراہ میں لگالیں گے جہاں انہیں اسلحہ سازی سے روکنا مشکل ہو گا کیونکہ درہ آدم خیل کے قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدے ان پر لاگو نہیں ہوتے البتہ تیراہ میں کارخانوں کے قیام کی صورت میں حکومت کو یہ فائدہ ہو گا کہ آمدورفت کی سہولتوں کی کمی کے باعث اسلحہ کی قیمتوں میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا۔

۱۹۳۷ء میں درہ میں اسلحہ سازی کے بیس اور جمرود، عالم گودر میں ایک ایک کارخانہ تھا اور ان سب میں تقریباً دو ہزار بندوقیں ہر سال تیار ہوتی تھیں[۴۰] تاہم نومبر ۱۹۳۷ء تک اسلحہ سازی کے کارخانوں کو بند کرنے کی تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۱ء میں جنرل سٹاف نے درے کے کاریگروں کو سرکاری کارخانوں میں ملازمت دینے اور ان کی بنائی ہوئی بندوقوں کو پولیس کے استعمال میں لانے سے متعلق صوبائی حکومت کی تجویز پر غور کرنا شروع کیا لیکن یہ اس بنا پر مسترد کی گئی کہ دیسی اسلحہ زیادہ پائیدار نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اس اندیشے کا اظہار بھی کیا گیا کہ اگر درے کے کاریگروں کو سرکاری کارخانوں میں ملازمت دی گئی تو وہ اسلحہ کی تیاری میں مزید مہارت حاصل کر لیں گے جس سے حکومت کو فائدے کی بجائے زیادہ نقصان ہو گا۔ فروری ۱۹۴۲ء میں ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں کارخانوں کو بند کرنے کے سوال پر غور کیا گیا جس میں جنرل سٹاف نے یہ سفارش کی کہ درہ کے کارخانے بند کر دئے جائیں اور کارخانہ داروں اور پنجابی مستریوں کو ان کی مشینوں اور سامان کا معاوضہ دیا جائے۔ اجلاس میں اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ یہ وقت کارخانوں کی بندش کیلئے زیادہ موزوں ہے۔ تیراہ اور صوبہ سرحد میں حالات پر سکون ہیں اور اگر قبائل کو کافی معاوضہ دیا گیا تو نہ صرف آدم خیل بلکہ آفریدی قبائل اور اورکزئی بھی حکومت کی مخالفت نہیں کریں گے۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۴۲-۱۹۴۱ء کے موسم سرما میں کارخانوں کو بند کرنے کیلئے ضروری اقدامات کئے جائیں لیکن گورنر سرحد نے ایک بار پھر درہ کے کاریگروں کو معاوضہ دینے اور انہیں روزگار فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ کارخانوں کو بند کرنے کے سلسلہ میں درہ کوہاٹ کے آفریدیوں کے مواجب میں مستقل اضافہ کیا جائے اور قبائلی زعماء اور قبیلے کے دیگر افراد کو اسلحہ سے حاصل ہونے والے منافع کے برابر مواجب دیئے جائیں[۴۱]۔ انہوں نے جنرل سٹاف کی اس تجویز سے اختلاف کیا کہ ۴۲-۱۹۴۱ء میں کارخانوں کی بندش کے لئے اقدامات کئے جائیں۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ حکومت کے معاندین بالعموم اور تیراہ آفریدی بالخصوص اسی بنا پر

حکومت کی مخالفت کریں گے کہ حکومت ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ وہ سرکاری سڑکوں پر آمدورفت میں رخنہ بھی ڈال سکتے ہیں اور ساتھ ہی وزیرستان کے قبائل کی جانب سے بھی مخالفت کا اندیشہ ہوسکتا ہے تاہم اس نے یاد دلایا کہ اسلحہ کی تجارت کم کرنے کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقدامات کئے گئے ہیں۔

(۱) قبائلی علاقے میں لوہا اور اس قسم کا دیگر سامان لے جانے پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں جن سے اسلحہ کی صنعت کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔

(۲) فرنٹیر کنسٹبلری اور پولیس کی متعدد چوکیوں کو تلاشی لینے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔

(۳) فوج کے ہیڈکوارٹر نے چاند ماری کے بعد گولیوں کا سیسہ اکٹھا کرنے کے انتظامات کئے ہیں۔

(۴) حکومت نے پوٹاشیم کلوریٹ اور سلفائڈ کی تجارت پر پابندیاں عائد کی ہیں اور کوہاٹ اور پشاور کے اضلاع میں اسلحہ کی تجارت بند کرنے کیلئے خصوصی دفعات کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے۔[۴۲]

گورنر نے یہ تجویز پیش کی کہ جب تک دوسری عالمی جنگ کے نتائج انگریزوں کے حق میں ظاہر نہ ہوں تب تک کارخانوں کی بندش کا معاملہ ملتوی کیا جائے اور اس مقصد کیلئے موزوں وقت کا انتخاب کیا جائے۔

مرکزی حکومت نے مارچ ۱۹۴۲ء میں صوبائی حکومت کی یہ تجویز کہ درہ کے کاریگروں کا بنا ہوا اسلحہ ایڈیشنل پولیس کے استعمال میں لایا جائے اصولی طور پر منظور کی اور اس کے بعد درہ کے قبائل نے پشاور میں کارخانے لگانے شروع کئے۔ سب سے پہلے مستری غلام حیدر نے بھانہ ماڑی میں ایک کارخانہ لگایا جس میں پانچ پنجابی اور ۷۵ درے کے کاریگر کام کرتے تھے۔ غلام حیدر نے ایک ماہ میں سو سے ڈیڑھ سو تک بندوقیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا اور حکومت نے اس کی ایک بندوق کی قیمت چالیس روپے

مقرر کی تھی۔ اس کے علاوہ ملک سمند خان، ملک گل مست خان، ملک نور علی، ملک سرور خان، ملک عبدالخالق اور سید رسول نے مشترکہ طور پر پشاور کے غلہ گودام (ملکڑی گودام) کے قریب ایک کارخانہ قائم کیا جس میں ۳۰۰ مستری کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عالم گودر کے تین مستری شیر رحمان، یار خان اور فضل الرحمان بھی پشاور میں ایک کارخانہ لگانے پر راضی ہوئے۔[۴۳] حکومت نے غلام حیدر اور زرغن خیل کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اعلیٰ قسم کی بندوقیں تیار کریں گے، چوری چھپے بندوق فروخت نہیں کریں گے اور اپنی بندوقوں میں افغانستان کا بنایا ہوا سامان استعمال نہیں کریں گے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کارخانوں میں درہ آدم خیل کے ۷۵ فیصد کاریگر کام کرتے تھے۔ ۱۹۴۵ء میں پشاور میں اسلحہ کے (آ) بارہ کارخانے کام کر رہے تھے۔

۱۹۴۵ء کے اواخر میں حکومت نے پشاور کے یہ کارخانے بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ نو (۹) کارخانے یکم دسمبر ۱۹۴۵ء اور باقی تین جنوری ۱۹۴۶ء میں بند کئے گئے۔[۴۴] نتیجتاً ان کارخانوں کے کاریگروں نے ایک دفعہ پھر درہ کوہاٹ کا رخ کیا۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کارخانوں میں ۲۱۰۴۴ بندوقیں مرمت اور تیار کی گئی تھیں۔[۴۵]

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے درہ میں اسلحہ سازی کی صنعت کو کئی نازک مراحل سے گزرنا پڑا مگر پھر بھی یہ صنعت قائم رہی۔ آزادی سے ایک سال قبل دیسی اسلحہ کی مانگ زیادہ ہو گئی اور جنگ کشمیر ۱۹۴۸ء کے دوران اسلحہ کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہوا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاد کشمیر میں

(آ) ان کارخانوں میں زرغن خیل فیکٹری، غلام حیدر فیکٹری، علم گودر فیکٹری، افغان فیکٹری، غلام رضا فیکٹری، نور علی فیکٹری، آدم خیل فیکٹری، بنوں آرمز اور ٹل آرمز فیکٹریاں شامل تھیں

اکثر قبائل نے درہ کوہاٹ اور عالم گودر (خیبر ایجنسی) کا بنا ہوا اسلحہ استعمال کیا۔

قیام پاکستان سے چند برس قبل زوڑ کلی (پرانا گاؤں) کے درے شاہ نامی شخص نے ۳۸ بور پستول کے علاوہ چھرے دار بندوقیں بھی بنانی شروع کیں اور اسی طرح درہ میں مختلف نوع کا اسلحہ بننے لگا جس میں تھری ناٹ تھری رائفلیں اور ۳۸،۴۵۵ اور ۳۲ بور کے پستول شامل تھے۔ جہاد افغانستان (۹۲-۱۹۷۸) کے دوران کلاشنکوف اور راکٹ لانچرز کی مانگ بڑھ گئی اور درہ کے کاریگروں نے یہ اسلحہ بھی بنانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ درہ میں مختلف قسم کی توپیں بھی تیار ہونے لگیں۔ اس وقت درہ میں مختلف قسم کا خود کار اسلحہ تیار کیا جاتا ہے جو موثر کارکردگی کا حامل ہے اور ایک عام آدمی کیلئے یہ پہچان مشکل ہے کہ یہ اسلحہ امریکہ، یورپ اور دیگر ممالک میں تیار شدہ اسلحہ سے کیسے مختلف ہے۔ درہ میں پن پسٹل بھی تیار کئے جاتے ہیں جو شکل و صورت اور سائز میں ایک فاؤنٹن پن کے مانند ہوتے ہیں اور اس کی ایک وار سے ایک شخص موت کی نیند سلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح چھڑی نما بندوق بھی تیار کئے جاتے ہیں جو ضرورت کے وقت نابینا اور عمر رسیدہ افراد کیلئے ایک اعصا کا کام دیتے ہیں لیکن بوقت ضرورت اسے اپنی دفاع کیلئے بطور بندوق استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس کی گولی ایک شخص کیلئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

درہ آدم خیل میں مقامی کاریگروں کے علاوہ اس وقت پشاور، کوہاٹ، مردان، سوات اور صوبہ پنجاب کے مختلف اضلاع کے کاریگر اسلحہ سازی کے کام میں مصروف ہیں۔ ان میں زیادہ تر کاریگر زیارت کا کا صاحب، شیدو، اکوڑہ خٹک، باجہ بام خیل، جلبئی، خرماطو، توغ اور جنگل خیل سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ میانوالی، کیمبلپور اور کالاباغ کے کاریگر بھی یہاں کافی تعداد میں کام کرتے ہیں۔

اسلحہ سازی کی صنعت کی وجہ سے درہ آدم خیل کو قبائلی علاقہ میں مرکزی مقام حاصل ہو گیا ہے اور یہاں کا بازار جو قیام پاکستان کے وقت درجن بھر دو کانوں پر مشتمل تھا اب تقریباً ایک کلومیٹر کے علاقہ میں پھیل گیا ہے اور یہاں ہر وقت خوب گہما گہمی اور چہل پہل رہتی ہے۔

باب ہفتم

بودوباش

آدم خیل آفریدی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے قلعہ نما مکانات عموماً مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے ہوتے ہیں جن میں چند کمروں کے علاوہ ایک برآمدہ اور کشادہ صحن ہوتا ہے البتہ دشمنیوں کی وجہ سے ان گھروں میں عام طور پر روشندان نہیں رکھے جاتے۔ مکانات ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتے ہیں۔

ہر گھر میں روٹی پکانے کیلئے ایک تندور اور آٹا پیسنے کیلئے ہتھ چکی (میچن) (آ) ہوتی ہے "کٹ" (چارپائی) گھر کا عام فرنیچر ہے جسے سونے اور بیٹھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ گھر کی سجاوٹ مشرقی اور روایتی انداز میں کی جاتی ہے۔ سونے کے کمرے میں کراکری اور دیگر گھریلو سامان رکھنے کیلئے مٹی کی الماری بنائی جاتی ہے جو عموماً ایک میٹر چوڑی اور ڈیڑھ میٹر لمبی ہوتی ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد قبائل کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں

(آ) میچن (ہتھ چکی) قریباً ڈیڑھ، دو فٹ کے قطر کے دو چھوٹے گول پتھروں پر مشتمل ہوتی ہے اس میں اوپر والے پاٹ کی موٹائی تقریباً دو انچ ہوتی ہے اور اس کے ایک کنارے پر لکڑی کا تقریباً ایک فٹ اونچا دستہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرا پاٹ ایک میٹر اونچے چبوترے میں نصب ہوتا ہے۔

پشت در پشت لڑائیوں اور قبائلی بغض وعناد کا زمانہ تقریباً لد گیا ہے اور پر امن ماحول نے معاشی اور اقتصادی خوشحالی کے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے اب کچے گھروں کی جگہ پکے مکانات بن رہے ہیں جو جدید سہولتوں سے مزین ہوتے ہیں اور ان میں ہوا اور روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔

آدم خیل معاشرہ مشترکہ خاندانی نظام سے عبارت ہے جو نسل در نسل ورثہ کی صورت میں منتقل ہوتا رہا ہے۔ آدم خیل آفریدی اس نظام کو محبت اور سماجی تحفظ کا ایک بہتر ذریعہ اور ایک عظیم تربیت گاہ سمجھتے ہیں اور اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اس نظام سے راہ فرار اختیار کرنے والے لوگوں کو ذہنی پریشانیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ اس نظام کے تحت کنبے کے سارے افراد والد یا خاندان کے سربراہ کے زیر سایہ رہتے ہیں جو نہ صرف خاندانی معیشت کے منتظم بلکہ نوجوانوں کے اخلاق و کردار کے نگران بھی ہوتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس نظام میں خاندان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی اگاہ ہوتا ہے اور اسلئے سب مل جل کر خاندان کی اجتماعی بہبود کیلئے اپنے وسائل بروئے کار لاتے ہیں تاکہ خاندان کے تمام افراد کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم ہو سکیں۔ خاندان کے سب برسر روزگار افراد خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ نہ صرف اپنی کمائی اپنے بزرگ کے حوالے کرتے ہیں بلکہ اپنے بوڑھے والدین کے اخراجات کیلئے ہر ماہ ایک مقررہ رقم ارسال کرتے ہیں۔ یہ اسی نظام کی برکت ہے کہ اس میں عمر رسیدہ افراد ایک قیمتی اثاثہ نہ کہ ایک بوجھ سمجھے جاتے ہیں۔

پیار و محبت، فرض شناسی اور انسانی اقدار پر مبنی یہ نظام جو مغربی دنیا کیلئے باعث رشک رہا ہے آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے اور اکائی خاندانی نظام (میاں، بیوی اور بچے) فروغ پا رہا

ہے لیکن آدم خیل آفریدی کافی حد تک ایسے اثرات سے محفوظ ہیں اور آج بھی ان کے ہاں ایک ہی خاندان کی تین نسلیں بدستور ایک ساتھ مشترکہ خاندان کے طور پر رہتی ہیں۔

آفریدی راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ مذہب سے ان کی گہری وابستگی اس بات کا مظہر ہے کہ وہ سنگین نوعیت کے تنازعات کا فیصلہ قرآن پاک کے ذریعے کرتے ہیں اور جھوٹی قسم کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ نماز کو ذریعہ نجات اور روزے کو تزکیہ نفس، روحانی اور اخلاقی عظمتوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ان کے ہر گاؤں میں ایک مسجد ضرور ہوتی ہے جس میں پیش امام پانچوں وقت کی نماز پڑھانے کے علاوہ بچوں کو مذہبی درس بھی دیتا ہے۔ پیش امام کو مفت کھانا فراہم کیا جاتا ہے اور گاؤں کے لوگ وقتاً فوقتاً اس کی مالی اعانت بھی کرتے ہیں۔

آدم خیل آفریدی اہل سادات، میاں اور برگزیدہ ہستیوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور جن تنازعات کا فیصلہ وہ جرگوں کے ذریعے نہ کر سکیں وہ میاں خیل (حضرت کاکا صاحب اور دیگر بزرگوں کی اولاد) کے ہاتھوں طے کراتے ہیں۔ وہ بزرگوں کے مزارات کا بھی احترام کرتے ہیں اور اکثر لوگ اولاد نرینہ، بیماری سے صحتیابی اور دیگر مقاصد کے حصول کیلئے بزرگوں کے مزاروں پر دعائیں اور منتیں مانگتے ہیں۔ ان کے ہاں مختلف مزارات مختلف حاجت روائیوں کیلئے مشہور ہیں مثلاً وہ اولاد نرینہ کیلئے پیر بابا اور حضرت کاکا صاحب کے مزاروں پر حاضری دیتے ہیں۔ اسی طرح دولت کے حصول کیلئے سخی بابا، پھوڑے پھنسی کے علاج کیلئے پھندو بابا، جنات کا اثر زائل کرنے کیلئے حلیم گل بابا اور مختلف مقاصد کیلئے مخصوص مزارات پر حاضری دیتے ہیں اور جب ان کی خواہش پوری ہوتی ہے تو وہ ایک بکرا یا دنبہ ذبح کرتے ہیں یا کوئی چیز اللہ کے نام پر نذر کرتے ہیں۔ مزاروں کی تقدس کا اندازہ اس

امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قبائل مزار سے ملحقہ رقبہ میں لکڑی وغیرہ ذخیرہ کرتے ہیں اور کسی کو اس کو ہاتھ لگانے کی جرات نہیں ہوتی۔

توہم پرستی ہمارے معاشرے میں ہر جگہ موجود ہے اور جاہل اور ان پڑھ لوگوں کو چھوڑ کر بعض تعلیم یافتہ افراد بھی توہم پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ آدم خیل قبائل میں بھی گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کا رواج عام ہے۔ بچوں کو جنات، سائے اور نظر بد سے بچانے کیلئے دلچسپ تدابیر اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً نوزائیدہ بچے کے سرہانے چاقو، چھری وغیرہ اسلئے رکھتے ہیں کہ جنات اس کے قریب نہ آنے پائیں۔ بھوت پریت اور بدروحوں کے خوف سے چالیس دن تک زچہ و بچہ کو کمرے میں تنہا نہیں چھوڑا جاتا۔ اگر بچے کو قے اور دست کی شکایت ہو تو گھر کی کوئی بزرگ خاتون اسے بیماری کی بجائے نظر بد سمجھتے ہوئے آگ پر سیسہ تھامے مختلف قسم کی دعائیں پڑھتی اور بچے پر دم کرتی نظر آئیں گی یا پھٹکڑی کو جلا کر نظر بد اتاریں گی کیونکہ وہ نظر بد کا یہی واحد طریقہ سمجھتی ہیں۔ دم درود کے باوجود بھی اگر افاقہ نہ ہو تو پھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کا تالو نیچے اتر گیا ہے اسے پشتو میں جبئی کہتے ہیں۔ تالو کی بحالی کیلئے بچے کو کسی عمر رسیدہ شخص یا تجربہ کار آدمی کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ اس کیلئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ شہادت کی انگلی بچے کے منہ میں ڈالتے ہیں بعض اوقات دم درود کے بعد ایک رومال بچے کے گلے کے گرد لپیٹا جاتا ہے جس کے دوسرے سرے کو پکڑ کر بچے کی گردن کو دو، تین جھٹکے دیئے جاتے ہیں۔ اگر اس سے بھی افاقہ نہ ہو تو پھر نظر بد دور کرنے کیلئے بچے کے گلے میں تعویذوں کا ہار پہنایا جاتا ہے ان میں بعض پر کپڑے، بعض پر چمڑے اور بعض پر چاندی کے خول چڑھے ہوتے ہیں بعض اوقات کاغذ پر لکھے ہوئے تعویذ جنہیں "تخت" کہا جاتا ہے بچے کو ماں کے

دودھ یا پانی میں گھول کر پلائے جاتے ہیں اور باقی تعویذ گلے میں پہنائے جاتے ہیں۔

حرمل (کالادانا) جلانے سے بھی عموماً نظر بد دور کی جاتی ہے۔ اس مقصد کیلئے گھر کی عمر رسیدہ خاتون ہاتھ میں حرمل لئے بچے کے بدن کے گرد گھماتی ہے اور ساتھ ہی ایک لمبی چوڑی گردان بھی پڑھتی ہے۔ بعض اوقات یہی عمل سرخ مرچ سے بھی کیا جاتا ہے اور دم درود پڑھنے کے بعد مرچ کے دانوں کو آگ میں جلایا جاتا ہے۔ اسی طرح بچے کو نظر بد سے بچانے کیلئے اس کے ماتھے پر کالک (کالا نشان) لگایا جاتا ہے اور بعض اوقات اسے نظر بد کے خوف سے عمداً میلے کپڑوں میں رکھا جاتا ہے۔ قدرتی آفات سے بچنے کی غرض سے دنبہ ذبح کیا جاتا ہے اور اس کا خون گھر کی دیواروں یا دروازے پر چھڑک دیا جاتا ہے۔ پشتو کی مشہور ضرب المثل ہے کہ "دہ زخم زخور رغیگی خود سترگو زخور نہ رغیگی" یعنی بیمار تو دوا وغیرہ کھانے سے صحت یاب ہو سکتا ہے مگر نظر بد کا شکار شدہ فرد صحتیاب نہیں ہوتا۔ تعلیم کے فروغ کی بدولت آدم خیل قبائل میں یہ رسوم ختم ہوتی جارہی ہیں اور بچے کو کسی کاہن کے بجائے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا ہے لیکن پسماندہ علاقے کے لوگ اب بھی ایسی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

بعض مرد اور خواتین نظر بد کیلئے اتنی بدنام ہوتی ہیں کہ ان کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے "نظرئے دٹوپک ڈز دے" یعنی اس کی نظر بندوق کی گولی کے مماثل ہے اسلئے بچے کو گھر سے باہر لے جاتے وقت اس کے چہرے کو چادر یا کپڑے میں چھپایا جاتا ہے تا کہ اس کا سامنا ایسے خواتین و حضرات سے نہ ہو سکے۔ اسی طرح مائیں اپنے بچوں کو "بدغگ" یا آواز بد کے خوف سے میت کے گھر نہیں لے جاتیں ان کے علاوہ ان میں چند دوسرے توہمات بھی مروج ہیں۔ مثلاً کوے کا منڈیر پر بولنا مہمانوں کی آمد یا خوشخبری کی علامت

سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آٹا گوندھتے وقت اگر اتفاقاً تھوڑا سا آٹا زمین پر گر جائے تو یہ کبھی کبھی مہمان کی آمد اور بعض اوقات مصیبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رات کے وقت گھر کے قریب کتوں کی بلاوجہ غراہٹ یا رونے کی صورت میں متواتر بھونکنا گھر میں بیماری یا کسی بیمار کی موت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دائیں آنکھ کا پھڑکنا نیک شگون اور بائیں آنکھ کا پھڑکنا شگون بد سمجھا جاتا ہے۔ جب کسی کو ہچکی آنے لگے تو اس سے یہ مطلب اخذ کیا جاتا ہے کہ کوئی دوست یا رشتہ دار اسے یاد کر رہا ہے اگر جوتے اتارتے وقت اتفاقی طور پر کسی شخص کا ایک جوتا دوسرے جوتے کے اوپر چڑھ جائے تو یہ سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ داہنی ہتھیلی میں کھجلی دولت آنے کی اور بائیں کی مالی نقصانات کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ آفریدی خوابوں کی تعبیر کے بھی قائل ہیں اور چاند گرہن اور سورج گرہن سے بھی کئی توہمات وابستہ ہیں۔ بارش کے دوران اولے پڑنے شروع ہو جائیں تو ژالہ باری بند کرنے کی غرض سے اولے کو چاقو کے ذریعے درمیان سے کاٹ دیا جاتا ہے تا کہ اولے پڑنے بند ہو جائیں۔ طویل خشک سالی سے چھٹکارا پانے یا سخت گرمی کے موسم میں بچے راہگیروں پر پانی پھینکتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق ایسا کرنے سے بارش ہوتی ہے۔ جاڑے کے موسم میں جب کئی دنوں سے متواتر بارش ہوتی ہو تو بچے مٹی کے پتلے بناتے ہیں جن کو آفریدی "گنجیان" کہتے ہیں ان کے خیال میں گنجیان کی بدولت بارش تھم جاتی ہے۔ نئے مکان کے تعمیر کے بعد اس کی چھت پر کالی ہانڈی اوندھی رکھی جاتی ہے اور یا کالے رنگ کے جھنڈے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔

بگولے یا گرد و غبار کو عموماً جنات کی کارستانی پر محمول کیا جاتا ہے اور اس میں ان کی موجودگی لازم سمجھی جاتی ہے۔ اگر دو تین دن تک مسلسل آندھی چلے تو اس کی وجہ

کسی ظالم کے ہاتھوں بے گناہ افراد کی موت سمجھی جاتی ہے۔ اگر پیدائش کے وقت کسی بچے کے پیر پہلے نکل آئیں تو وہ "ساکی" کہلاتا ہے اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے پاؤں دلوانے سے کمر کا درد غائب ہو جاتا ہے۔ آفریدی پیروں فقیروں پر یقین رکھتے ہیں وہ ان کی ناراضگی مول لینا پسند نہیں کرتے اور ایسے لوگوں کی بددعا سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں جو "تور جبی" یا کالی زبان والے کہلاتے ہیں۔ کالی زبان کے لوگوں کی بددعا بندوق کی گولی سے بھی زیادہ خطرناک سمجھی جاتی ہے۔ محبت میں کامیابی اور دوسری خواہشات کی تکمیل کیلئے اکثر تعویذ گنڈے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ بعض لوگ تعویذ گنڈے کو امراض واموات کا سبب بھی سمجھتے ہیں۔ یہ تعویذ "کوڈے" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

مذہبی کتابوں کے ذریعے فال نکالنے کا رواج بھی عام ہے۔ شب برات کے موقع پر گاؤں کی عورتیں اور دوشیزائیں ایک گھر میں جمع ہو جاتی ہیں۔ ہر عورت یا لڑکی خالی گھڑے میں کنگھی، چوڑیاں، انگوٹھیاں یا کوئی دوسری چیز بطور نشانی ڈال دیتی ہے اور پھر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس لڑکی یا لڑکا باری باری چیزیں نکالتا ہے۔ چیز نکالتے وقت ایک عورت کوئی چٹکلہ یا کہاوت پڑھتی ہے۔ جیسا کہ "مہ جنغ کوہ مہ سپارہ۔ خدائے بہ درکڑی پہ تیارہ" یعنی خدا تمہیں ہل چلائے بغیر بھی روزی دے گا۔ چٹکلے یا کہاوت سے اچھا یا برا شگون لیا جاتا ہے۔ چٹکلہ جتنا بامعنی اور موزوں ہو گا اس شخص کی قسمت اتنی اچھی سمجھی جائیگی۔ ان توہمات میں اکثر کا تعلق خواتین سے ہے اور یہ اب بھی پسماندہ علاقوں میں موجود ہیں۔

آفریدی جنوں، بھوتوں، پریوں اور چڑیلوں کے وجود کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں جنات، درند، پرند، چرند یا کسی اور ذی روح کا روپ دھار سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک جن دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے اور برے، خدا ترس اور ظالم۔ اچھے جن کی دوستی سے انسان

کی قسمت بدل جاتی ہے اور وہ اڑے وقت دوست کی مدد کیلئے تیار رہتا ہے۔ پریاں جو پشتو میں "خاپیرئی" کہلاتی ہیں قدرت کی خوبصورت اور حسین مخلوق سمجھی جاتی ہیں۔ جس شخص کے ساتھ دوستی کر لیتی ہیں اس کے دن پھر جاتے ہیں وہ اپنے دوست کی خواہش پوری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں اسلئے قلیل سی مدت میں کسی غریب آدمی کے خوشحال ہونے پر عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے پریوں کا دودھ پیا ہے۔

پریوں کے ساتھ جس مرد عورت کی دوستی ہو اس کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کھوئی ہوئی اشیاء کا سراغ لگانے اور آنے والے حالات و واقعات کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ جب کسی ایسے فرد سے کھوئی ہوئی چیز کے متعلق پوچھا جائے تو وہ اپنے اوپر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری کر لیتا ہے اور پھر ہسٹریائی انداز میں پیشگوئیاں کرتا ہے۔ ضعیف الاعتقاد لوگ اس کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اسے کچھ رقم بطور نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ سادہ لوح لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض خواتین نے اسے روزی کمانے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

اگر کوئی شخص مخبوط الحواس افراد جیسی حرکتیں کرنے لگے تو یہ سننے میں آتا ہے کہ اس پر جنوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ یہ عقیدہ عام ہے کہ جس شخص پر جنات کا سایہ ہو جنات اس کی زبان کو قابو میں کر لیتے ہیں اور پھر اسے اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں ہوتا۔ جب کسی فرد پر جنات کے سائے کا شبہ ہو تو فوراً کسی سید، میاں، مولوی یا عامل کو بلایا جاتا ہے جو آیات مقدسہ پڑھنے کے بعد جنات کو چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔ اگر نرم لہجہ کارگر ثابت نہ ہو تو پھر انہیں سخت اور تادیبی انداز میں حکم دیا جاتا ہے۔ اگر اس سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو تو پھر آسیب اتارنے کیلئے وہ آیات قرانی لکھ کر متاثرہ افراد کے

نتھنوں کے قریب دھونی دیتا ہے۔ بعض اوقات کوئی طاقتور شخص آسیب زدہ فرد کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اس وقت تک سختی کے ساتھ دبائے رکھتا ہے جب تک وہ مارے درد کے چیخنا چلانا شروع نہ کردے۔ یہ عقیدہ بھی عام ہے کہ جنات آسیب زدہ شخص کی زبان سے بولتے ہیں اسلئے آسیب اتارنے والا شخص یا عامل ڈانٹ ڈپٹ کے انداز میں انہیں چلے جانے، جنات کے بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھانے اور یہ عہد کرنے کو کہتا ہے کہ وہ پھر لوٹ کے نہیں آئیں گے۔ بعض اوقات آسیب زدہ شخص کی انگلیوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی گول لکڑیاں رکھ کر اس کے ہاتھ کو سختی سے دبایا جاتا ہے یہ طریقہ بھی ناکام ہو جائے تو پھر عامل ایک کڑاہی میں تھوڑا سا گھی گرم کرتا ہے اور تعویذ گنڈا اس میں ڈال دیتا ہے۔ بعض اوقات جنات کا اثر زائل کرنے کی غرض سے آسیب زدہ شخص کو راکھ ملا ہوا پانی بھی پلایا جاتا ہے۔ ایسے عامل جنہوں نے تعویذ، اعمال اور دم جھاڑ کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

قبائلی خواتین

قبائلی علاقے میں خواتین کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسلئے وہ اپنے علاقے میں بغیر کسی خوف کے پہاڑوں، کھیتوں اور ہر جگہ آزادانہ طور پر گھومتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ آدم خیل قبائل کے مختلف دیہاتوں میں ایک خاندان اور رشتے کے لوگ بستے ہیں اسلئے خونی رشتوں کے باعث گاؤں کے اندر اور باہر بھی پردہ کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ پردہ نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قبائلی معاشرہ میں خواتین کی عصمت، آبرو اور ناموس کی خاطر جان کی بازی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اسلئے

کسی شخص کو خواہ وہ کتنا بارسوخ اور صاحب حیثیت کیوں نہ ہو خواتین کو چھیڑنے یا ان کی بے حرمتی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی جو کوئی قبیلے کے مروجہ ضابطہ اخلاق اور اس کی سماجی اقدار کے خلاف قدم اٹھاتا ہے اسے موت کی صورت میں اپنے کئے کی سزا ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرد و خواتین آپس میں ناجائز مراسم استوار کرنے سے گریز کرتے ہیں اور جب کبھی ایسا ہوا تو ان کو ان کے جرم کی پوری پوری سزا دی گئی ہے۔

آدم خیل خواتین جب گھر سے گھاس یا لکڑی لانے کی غرض سے باہر نکلتی ہیں تو مرد ان کا پیچھا کرنے یا بات چیت کے مواقع حاصل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اسی طرح خواتین بھی کسی مرد کے ساتھ غیر ضروری بات چیت کرنا اچھا نہیں سمجھتیں۔ اسی ضمن میں وار برٹن لکھتے ہیں "کسی عورت حتیٰ کہ دس سال سے زیادہ عمر کی لڑکی کو غیر مردوں سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ اجنبی لوگوں کے ساتھ بات چیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اتفاقی طور پر کسی راستے یا سڑک پر کسی اجنبی مرد کا اچانک سامنا ہو جانے پر عورتیں اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہیں یا پھر منہ موڑ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ راہگزر پر خواتین کا سامنا ہونے پر مرد نظریں جھکا لیتے ہیں اور ان کیلئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں"۔

پٹھان معاشرہ اور آفریدی قبائل کے روایتی آئین اور قانون میں عورت کی عصمت و عفت کو ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ پٹھان کردار کا شیوہ ہے کہ عورت پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا جاتا۔ اور اس کو کوئی زک نہیں پہنچایا جاتا۔ اگر کسی قصوروار اور مجرم خاندان کی ایک عورت متاثرہ فرد یا خاندان کے گھر جائے تو وہ عفو کے دروازے کھولتا ہے۔ دو مخالف گروہوں کے درمیان لڑائی کی صورت میں نہ تو عورتوں کی آزادانہ آمدورفت پر کسی قسم کی پابندی لگائی جاتی ہے اور نہ ان پر گولی چلائی جاتی ہے بلکہ خواتین مورچوں میں مقیم

افراد کو آزادی کے ساتھ خوراک اور پانی بہم پہنچاتی ہیں۔ ۱۸۶۳ء میں بولا کی خیل اور گڈیا خیل آفریدیوں کے درمیان لڑائی کے موقع پر ایک دفعہ حسن خیل کے لعل میر نامی شخص اور بولا کی خیل شاخ کے چند افراد نے گڈیا خیل کی عورتوں کا راستہ دوکا اور قبائلی روایات کے بر عکس انہیں اپنے مردوں کے پاس خوراک کی اشیاء لے جانے سے منع کیا تو اس پر نہ صرف لڑائی مزید شدت اختیار کر گئی بلکہ قومی جرگے کے فیصلے کے مطابق خواتین کی مبینہ بے حرمتی کے مرتکب افراد کے چار گھر بھی جلا دیئے گئے افغانستان کے "امان افغان" نامی اخبار نے مس ایلس کی اغوا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "ایک قوم کیلئے سب سے بڑا صدمہ اس کے قومی آثار کو صدمہ پہنچانا ہے ----- افغان قوم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے اپنی آزادی سے محبت ہے اور عورت کی حفاظت اس کا ایمان۔ چنانچہ ان کے اصطلاح میں لفظ ننگ سے بھی مراد عورت کی عزت اور اس کے ناموس کی حفاظت ہے۔ ایک افغان عورت یا لڑکی کے ناموس کی توہین سب سے بڑا صدمہ ہے جو اس کے قومی اداب کو پہنچایا جاسکتا ہے اور اس صدمے کا انتقام بھی شدید ترین انتقامی جذبے کے تحت لیا جاتا ہے۔ مسز ایلس اور مس ایلس کا واقعہ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ ہے جس کا سبب وہ جذبہ انتقام ہے جو افغان قوم کے قومی ناموس کی بے حرمتی پر پیدا ہوا"۔

بعض ناقدین نے قبائلی خواتین کی سماجی حیثیت کو غلط انداز میں پیش کرتے ہوئے انہیں ایک اقتصادی اثاثے سے تعبیر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ معاشرتی لحاظ سے اتنی کمتر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قبائلی خواتین کھانا پکاتی ہیں، گھر کی صفائی کرتی ہیں، پانی بھرتی ہیں، جانوروں کو چارہ ڈالتی ہیں اور ان کا دودھ دوہتی ہیں، بچوں کی نگہداشت اور دیگر گھریلو فرائض بجالاتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی سماجی حیثیت نہیں

رکھتیں بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے دائرہ اختیار کے اندر کافی اثر ورسوخ کی حامل ہوتی ہیں۔

توره (لفظی معنی شمشیر کے ہیں لیکن پشتو میں اس سے مراد بہادری ہے) اور مڑانہ (شجاعت اور دلیری) پٹھانوں بشمول آفریدیوں کی کردار کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ آفریدی عورتیں بھی دلیر ہوتی ہیں اور اپنے شریک حیات اور رشتہ داروں میں بھی ایسی ہی صفات کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ لوک گیتوں میں بھی وہ اپنے محبوب کو میدان جنگ سے بزدلوں کی طرح بھاگنے کی بجائے ہمت اور شجاعت کے مظاہرے کی ترغیب دیتی ہیں۔ پشتو کا یہ ٹپہ اور سینکڑوں دیگر ٹپے ان کی اس خواہش کی عکاسی کرتے ہیں۔

دبے ننگئ آواز دے رامہ شہ مینہ　　　سورے سورے پہ گولو راشے

(تیرا گولیوں سے چھلنی ہو کر آنا میرے لئے تیری بزدلی کی خبر سننے سے پسندیدہ تر ہے)

آفریدی خواتین کی عزت وابرو کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا بدلہ کھلے بندوں لیا۔ ایسی ہی ایک مثال عجب خان نے پیش کی تھی اس نے جان پر کھیل کر اپنی خواتین کی بے عزتی کا بدلہ لیا۔

قبائلی خواتین سادہ لباس پہنتی ہیں جو "پرتوگ" (شلوار) "خت" (قمیص) "ٹکرے" (دوپٹہ) پر مشتمل ہوتا ہے۔ علاقہ آفریدی میں کالے رنگ کے ڈھیلے کپڑے عمر رسیدہ خواتین کا پسندیدہ لباس ہے البتہ دوشیزائیں شوخ رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں لیکن اب شہری لوگوں کے ساتھ زیادہ میل جول کی وجہ سے فیشنی کپڑوں اور جوتوں کا رواج عام ہوتا جارہا

ہے اور چاندی کے بھاری بھر کم زیورات کی جگہ سونے کے نازک اور نفیس زیورات لے رہے ہیں جن میں ماتھے کا جھومر، کانوں کے جھمکے، گلوبند یا گلے کا ہار، انگوٹھیاں اور سونے کی چوڑیاں شامل ہیں البتہ دورافتادہ مقامات کی خواتین تتھ (انتکئی) بولو (پیزوان) ٹکہ (ٹیک) پازیب (سنگلئی) اور کنگن استعمال کرنا پسند کرتی ہیں۔ آفریدیوں کے پرانے زیورات میں حسی (اوگئی) باھو (باوؤ) چوڑی شیکہ دار، تعویزونہ، چارگل مرصع اور جرموٹئی شامل تھیں۔

باب ہشتم

جمہوری ادارے

حجرہ

پٹھانوں کی سماجی زندگی میں حجرے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور آفریدی قبائل کے ہر گاؤں میں خواہ وہ کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، ایک حجرہ ضرور ہوتا ہے جہاں تنازعات کے تصفئے کیلئے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ حجرہ نوجوانوں میں کردار سازی کے عمل کو فروغ دینے کیلئے ایک تربیت گاہ کا کام دیتا ہے جہاں نوجوان بزرگوں کا ادب سیکھنے اور اپنے تہذیب اور روایت پر عمل پیرا ہونے کی تربیت پاتے ہیں۔ یہاں جوانوں کی محفلیں سجتی ہیں اور مہمانوں کی آو بھگت اور قیام وطعام کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کے موقع پر معززین علاقہ اور گاؤں کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ منگنی یا شادی کا اعلان بھی سب افراد کی موجودگی میں حجرے ہی میں کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر یہاں خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں اور نکاح بھی حجرے کی مسجد میں پڑھایا جاتا ہے۔ غمی کے موقع پر سوگوار خاندان سے اظہار تعزیت کیلئے لوگ یہی جمع ہوتے ہیں اور کئی دنوں تک فاتحہ خوانی کیلئے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

حجرہ دراصل ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی مل بیٹھنے کی جگہ کے ہیں اس سماجی ادارے کی بنیاد انسان دوستی، محبت اور اخوت کے رشتوں پر استوار ہے۔ یہاں گاؤں کے بزرگ مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کے علاوہ باہمی دلچسپی کے معاملات کیلئے مشترکہ لائحہ

عمل مرتب کرتے ہیں۔یہاں خاندانی رنجشیں دور کرنے کے طریقے سوچے جاتے ہیں اور
جرگہ کے موقع پر یہ ایک کمرہ عدالت یا اسمبلی ہال کا منظر پیش کرتا ہے۔ مولانا عبدالقادر
حجرے کے بارے میں رقمطراز ہیں "ہرقوم کی زندگی میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات ہوتی
ہیں جو اس کی سماجی زندگی کی بنیاد کہی جاسکتی ہیں اور جن پر اس کی اجتماعی زندگی کا
انحصار ہوتا ہے۔ ترک معاشرے میں قہوہ خانے کا جو مقام ہے وہی افغانوں کی زندگی کی
بنیاد کہی جاسکتی ہیں اور جن پر اس کی اجتماعی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ ترک معاشرے
میں قہوہ خانے کا جو مقام ہے وہی افغانوں کی زندگی میں حجرے کو حاصل ہے۔ پٹھان کی
سماجی زندگی ابتدا سے لے کر انتہا تک حجرے سے وابستہ ہے۔ حجرے کے بغیر کسی افغان
گاؤں، خاندان یا گروہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔"

پٹھان بشمول آفریدی اپنی روایتی مہمان نوازی کیلئے مشہور ہیں اور ان کے
حجروں کے دروازے مہمانوں کیلئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔حجرہ میں موجود لوگ مہمانوں کی
خاطر تواضع اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا
کھاتے ہیں۔ آدم خیل کے حجرے ایک کشادہ صحن، ایک یا دو برآمدوں اور دو یا تین کمروں پر
مشتمل ہوتے ہیں اور ان کے پہلو میں مسجد بھی تعمیر کی جاتی ہے۔ یہاں دس بیس
چارپائیاں، بسترے اور تکئے موجود ہوتے ہیں جو مہمانوں کیلئے استعمال کئے جاتے ہیں۔
حجرہ مشترکہ نشست گاہ کی حیثیت سے گاؤں کے لوگوں کی اجتماعی ملکیت ہوتا ہے وہ اسے
مشترکہ طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس کی مرمت وحفاظت بھی سب کے ذمے یکساں
ہوتی ہے۔

حجرہ اور چلم (حقہ) گھڑا اور رباب لازم ملزوم ہیں۔ چلم یعنی حقے کو آج بھی
حجرے میں اپنا دیرینہ مقام حاصل ہے لیکن رباب اور گھڑے کی سر تال مفقود ہوتی جارہی ہے
اور ان کی جگہ ریڈیو، ٹرانزسٹر اور ٹیلی ویژن لے رہے ہیں تاہم جہاں یہ سہولتیں دستیاب
نہیں وہاں رات کے وقت نوجوان حجرہ میں گھڑے کی تھاپ اور رباب کے آہنگ سے دل
بہلاتے ہیں اور گھڑے اور رباب کی سنگت میں کبھی رحمان بابا کا عارفانہ کلام ترنم سے سناتے
ہیں اور کبھی منظوم لوک داستانیں گا کر اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔حجرے عموماً قلعہ نما
شکل میں تعمیر کئے جاتے ہیں اور یہ گاؤں کیلئے ایک دفاعی مورچے کا کام دیتے ہیں۔ان میں
گاؤں کی حفاظت کیلئے ایک دو اونچے گول یا چوکور برج بنائے جاتے ہیں جسے آفریدی اٹارئی
کہتے ہیں۔لڑائی کے دوران ان مورچہ نما برجوں سے دشمن پر فائرنگ کی جاتی ہے۔ گاؤں کے
غیر شادی شدہ جوان رات کو حجرے میں سوتے ہیں اور دشمنی یا فائرنگ کی صورت میں ان
برجوں سے دشمن کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

جرگہ

آفریدی فطرۃً جمہوریت پسند ہیں اور ان کے سماجی نظام میں جرگہ جمہوری اقدار
کے احیاء کی علامت ہے۔ جرگہ جس میں یونان کے قدیم جمہوری اداروں کی جھلک ملتی ہے
انصاف کے حصول کے سلسلہ میں بڑا موثر اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔اس نظام کی موجودگی
میں قبائل کو حصول انصاف کیلئے نہ تو قانون دانوں کی پیشہ ورانہ خدمات کی احتیاج ہوتی ہے۔
نہ عرصہ دراز تک مقدمات لڑنے پڑتے ہیں بلکہ متنازعہ امور کا فیصلہ افہام وتفہیم سے جرگے کے
ذریعے کیا جاتا ہے۔ چونکہ قبائلی علاقہ میں عام ملکی قوانین نافذ العمل نہیں اسلئے تنازعات کا

فیصلہ شرعی قوانین اور یا علاقائی رسم و رواج کے مطابق کیا جاتا ہے۔

جرگہ کے اراکین کے انتخاب کیلئے کوئی خاص وضع کردہ اصول یا طریقہ کار موجود نہیں۔ قوم اور قبیلہ کے تمام سفید ریش جو سپین گیری یا مشران کہلاتے ہیں، جرگہ کے رکن مانے جاتے ہیں مگر ان کیلئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ مخلص، دیانتدار، تجربہ کار، حق گو اور بے داغ کردار کے مالک ہوں ان سب کو برابری کی بنیاد پر اپنا نکتہ نظر پیش کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ عدالتی کاروائی کی طرح جرگہ کے ارکان فریقین کو اپنا موقف بیان کرنے کا حق دیتے ہیں اور ان کے بیانات کی روشنی میں متنازعہ امور کے مختلف پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد جھگڑے کا ایک منصفانہ اور پائیدار حل تلاش کرتے ہیں۔ ارکان جرگہ کافی بحث و تمحیص کے بعد جب کسی فیصلے پر متفق ہو جاتے ہیں تو اس کا اعلان کر دیا جاتا ہے یہ فیصلہ کثرت رائے کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ فیصلے کے اعلان سے قبل جرگہ فریقین سے اختیار (جسے پشتو میں واک کہتے ہیں) لیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فریقین جرگہ کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ اس طرح جرگے کے فیصلے کو حرف آخر کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے اور فریقین پر اس کا اطلاق لازمی ہوجاتا ہے۔ اس سے قبل فریقین سے مچلکہ کی صورت میں ہزاروں یا لاکھوں روپے کی رقم بطور ضمانت لی جاتی ہے یا جرگہ کے پاس مقررہ رقم کی مالیت کے بندوق رکھے جاتے ہیں اگر "واک" کے باوجود کوئی فریق جرگہ کے فیصلے سے روگردانی کرے تو جرگہ اس کی مذمت کرتا ہے جسے پشتو میں "مخ اڑہ ول" (منہ پھیرنا) کہتے ہیں اور عہد شکنی کے مرتکب فریق کو سزا دی جاتی ہے جس میں باغی فریق سے جرمانہ وصول کرنا یا ضمانت کے طور پر جمع شدہ رقم یا بندوقوں کا ضبط کرنا، اس کے خلاف لشکر کشی کرنا اور گاؤں وغیرہ جلانا شامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سنگین سزا کی موجودگی میں کسی

کو عہد شکنی کی جرات نہیں ہوتی۔ جرگے کے فیصلے پر عدم اعتماد یا اس کو قبول نہ کرنے والے فریق کی بطور ضمانت جمع شدہ رقم ضبط کی جاتی ہے لیکن باغی فریق کو دوسرے جرگے سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جبکہ جرگہ کے فیصلے کو قبول کرنے والے فریق کو جرگہ کا فیصلہ تحریری شکل میں دیا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے موقف کے دفاع میں نئے جرگہ کے سامنے پہلے والے جرگے کا فیصلہ پیش کر سکے۔ سنگین نوعیت کے تنازعات میں جرگہ مدعا علیہ سے یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قران پاک کی قسم اٹھا کر اپنے آپ کو مبینہ الزام سے بری الذمہ ٹھہرائے۔ جرگہ کا اجلاس عموماً ایک دن یا زیادہ پیچیدہ تنازعات کی صورت میں چند دن جاری رہتا ہے۔ اسی دوران جرگہ کی خوب خاطر تواضع کی جاتی ہے اور یوں مہمان نوازی پر خاصی رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ اگر جرگہ کے چند ارکان اپنے دوسرے ساتھیوں سے اختلاف رکھتے ہوں تو جرگہ کوئی فیصلہ دئے بغیر ختم ہو جاتا ہے اور پھر تصفیہ کیلئے دوسرا جرگہ بلانا پڑتا ہے۔

جرگہ تین قسم کا ہوتا ہے، مقامی یا گاؤں کا جرگہ، علاقائی یا قومی جرگہ اور سرکاری جرگہ، خاندانی تنازعات کو طے کرنے کیلئے گاؤں کا جرگہ عموماً چار، پانچ ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اور کسی تنازعہ کی صورت میں آفریدی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "سلور وتہ راسرہ کینہ" یعنی کہ یہ معاملہ چار بزرگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ خاندانی معاملات میں قومی اور علاقائی جرگہ اس وقت تک مداخلت نہیں کرتا جب تک اس سے باضابطہ درخواست نہ کی جائے البتہ سنگین نوعیت کے معاملات میں جرگہ خود مداخلت کرتا ہے اور فریقین کو اپنے فیصلے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جرگہ کا اجلاس عموماً حجرہ یا گاؤں کے باہر کھیتوں میں پیڑ تلے منعقد کیا جاتا ہے

جرگہ کے ارکان دائرے یا نیم دائرے کی شکل میں بیٹھ کر درپیش مسائل پر آزادانہ بحث اور غور کرتے ہیں۔ نظام جرگہ کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ ایک قانون ساز اسمبلی کی طرح نہ تو اس کا کوئی صدر ہوتا ہے نہ سپیکر، اس کے تمام ارکان اثر ورسوخ اور مالی حیثیت کے امتیاز کے بغیر برابر اور یکساں سمجھے جاتے ہیں اور انہیں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ علاقہ میں امن وامان برقرار رکھنے، مظلوموں کی دادرسی کرنے اور مختلف مسائل کا منصفانہ حل تلاش کرنے کے علاوہ علاقائی یا قومی جرگہ حکومت اور قبائل کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ایک طرف یہ حکومت کو قبیلے کے لوگوں کے جذبات اور احساسات سے اگاہ کرتا ہے دوسری طرف حکومت کے فیصلے بھی اسی کے ذریعے قبائل تک پہنچائے جاتے ہیں۔

سرکاری جرگہ روایتی قبائلی جرگہ سے اس لحاظ سے مختلف ہوتا ہے کہ اس کے ارکان کا چناؤ پولیٹیکل ایجنٹ یا متعلقہ ڈپٹی کمشنر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک مشاورتی کونسل کے طور پر فرائض انجام دیتا ہے اور پولیٹیکل حکام کو اس کا فیصلہ رد کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے تاہم سنگین نوعیت کے تنازعات میں اس جرگہ کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جرگہ جو آج تک سستے انصاف کی فراہمی کا سب سے اہم ذریعہ تھا اب پرہ جنبہ، یعنی فریق بازی کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنی افادیت کھو رہا ہے۔ اب قبائلی علاقہ میں بھی رشوت کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں اور رشوت کے بل بوتے پر منصفانہ فیصلے سے انحراف کیا جا سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ اور جذبہ باقی نہیں رہا جس کے تحت منصفانہ فیصلے اللہ کی خوشنودی حاصل

کرنے کی غرض سے کئے جاتے تھے۔ اس کے برعکس اب پیشہ ور جرگہ بازوں کی فیس (جو مچلکہ کی صورت میں ان کے ہاتھ آتی ہے) ملک کے مشہور و معروف وکلاء کی فیس سے بھی بڑھ گئی ہے اور یوں غریب لوگوں کو انصاف کے حصول میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔

باب نہم

مخصوص روایات

دیگر پٹھانوں کی طرح آفریدی قبائل بھی صدیوں پرانی سماجی اور معاشرتی روایات سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور ان کے مروجہ رسوم میں پختونولی سرفہرست ہے جسے پٹھان معاشرہ میں تاریخی عظمت اور ملی روایات اور احساسات کا آئینہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یہ جذبہ حب الوطنی، شجاعت، غیرت، سچائی، دیانتداری، ہمدردی اور مہمان نوازی کا دوسرا نام ہے۔ ان مسلمہ اصولوں سے انحراف یا روگردانی کو قبائلی معاشرے میں سماجی اقدار کے منافی فعل سمجھا جاتا ہے اور جو شخص ان اصولوں سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے اسے معاشرے میں پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ آدم خیل آفریدیوں کی قابل ذکر رسوم میں کانڑے، ننواتے، بدل اور میلمستیا شامل ہیں۔ یہی رسوم زیر نظر شکل یا معمولی ردو بدل کے ساتھ تمام پٹھان قبیلوں میں مروج ہیں۔

کانڑے

کانڑے کا لفظی معنیٰ 'پتھر' ہے۔ اس رسم کی رو سے جسے تیگہ بھی کہا جاتا ہے خون خرابے کو بند کرنے اور امن وامان قائم کرنے کیلئے سعی کی جاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر کانڑے عارضی فائر بندی کو کہتے ہیں جس کے دوران متحارب فریقین ایک دوسرے کے خلاف مخاصمانہ کاروائیاں ترک کر دیتے ہیں۔ کانڑے کا اعلان اس وقت کیا جاتا ہے جب دو مخالف فریقین کے درمیان تنازعہ جنگ وجدل کی صورت اختیار کرلیتا ہے اور نتیجتاً بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں، مورچوں اور خندقوں سے شب وروز ایک دوسرے پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ اسی دوران موت کے بھیانک سائے سینکڑوں افراد کے سروں پر

منڈلاتے ہیں اور بغض وعناد اور دشمنی کی فضا میں قیمتی جانوں کے تلف ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ جب حالات ایسی نازک صورت اختیار کرلیتے ہیں تو قوم قبیلہ کے مقتدر زعماء سفید ریش اور مذہبی پیشوا کشت وخون بند کرنے اور فائر بندی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مقصد کیلئے وہ ایک معینہ مدت یعنی چند دنوں، ہفتوں یا مہینوں کیلئے کانڑے رکھتے ہیں۔ اسی طرح علاقے میں عارضی طور پر امن وامان قائم ہوجاتا ہے جو بعد میں جرگہ کی کوششوں کے نتیجہ میں مستقل صلح کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ کانڑے رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متصادم فریقین کے درمیان عداوت اور دشمنی کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں اور انہیں متنازعہ امور کے پرامن حل کیلئے سوچ بچار کا موقع فراہم کیا جا سکے۔ اسی سلسلہ میں جرگہ اہم کردار ادا کرتا ہے اور عہد شکنی کی صورت میں جرمانے کے طور پر مقررہ رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تعین کانڑے رکھنے کے موقع پر کیا جاتا ہے اگر کانڑے توڑنے والا فریق جرمانے کی ادائیگی میں لیت ولعل سے کام لے تو اس کے خلاف لشکر کشی کی جاتی ہے۔

ننواتے

ننواتے بھی ایک دلچسپ رسم ہے جس میں عفو درگزر کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ننواتے کے لفظی معنیٰ 'اندر داخل ہونے یا پناہ مانگنے کے ہیں۔ اس رسم کے تحت ایسے شخص کو بھی معاف کیا جاتا ہے جس کے ہاتھوں صاحب خانہ نے صعوبتیں برداشت کی ہوں یا اس کا والد، بھائی، لخت جگر یا دوسرے عزیز واقارب اس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں بالفاظ دیگر ننواتے مکدر فضا کو خوشگوار بنانے اور سالہا سال کی دشمنی اور رنجش کو ختم کرانے کا ایک مخصوص طریقہ ہے جس کے ذریعے قتل جیسا سنگین جرم بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے کئے پر پشیمانی کا اظہار کرنے کے بعد دشمن کے ساتھ صلح وآشتی کے ساتھ رہنے کا عزم کرتا ہے تو وہ اپنے مخالفین کے ہاں ایک جرگہ لے جا کر اپنے کئے پر تاسف

کا اظہار کرتا ہے۔ میزبان کی وہ آنکھیں جو ہر لمحہ دشمن کے لہو کیلئے ترس رہی ہوتی ہیں ننواتے کی وجہ سے جذبہ درگزر سے پرنم ہو جاتی ہیں اور مقتدر زعماء کی درخواست پر وہ اپنے دشمن کو معاف کر دیتا ہے۔ صلح صفائی کے بعد ننواتے کرنے والے شخص کی طرف سے بھیجے ہوئے دنبے حجرے میں ذبح کئے جاتے ہیں اور دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔

اگرچہ سرحد کے تمام علاقوں میں ننواتے کے رسوم میں تقریباً یکسانیت پائی جاتی ہے تاہم علاقہ آفریدی میں ایک فریق کی عورتیں قران پاک سر پر اٹھائے دشمن کے گھر میں داخل ہوتی ہیں چونکہ پٹھان معاشرہ میں خواتین کو عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور قران حکیم کے تقدس کو بھی پٹھان اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں اسلئے ان وجوہات کے بنا پر دشمن کو معاف کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص علی الصبح کسی نہ کسی طرح دشمن کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اس وقت تک چولہے کے پاس بیٹھا رہتا ہے جب تک اس کے ننواتے کو قبول نہ کیا جائے۔ اگر کسی شخص کے ننواتے کی قبولیت میں زیادہ دشواریاں حائل ہوں تو پھر وہ اس وقت تک انتظار کرتا رہتا ہے جب تک دشمن کے گھر میں کوئی میت نہ ہو جائے ایسے موقع پر جب جنازہ گھر سے نکلتا ہے تو وہ آگے بڑھ کر چارپائی کا پایہ پکڑ لیتا ہے اور با آواز بلند کہتا ہے "میں ننواتے لے کر آیا ہوں۔ اس وقت تک جنازے کو جانے نہیں دونگا جب تک ننواتے کو قبول نہیں کیا جاتا"۔ اس منظر کو دیکھتے ہی میت کے عزیز واقارب اسے معاف کر دیتے ہیں تاہم ایسے ننواتے ہر گز قبول نہیں کی جاتی جو خواتین کی عزت و آبرو سے متعلق ہو کیونکہ پٹھان معاشرہ میں خواتین کی بے حرمتی سنگین اور ناقابل معافی جرم سمجھی جاتی ہے۔ معززین علاقہ ایسے ننواتے میں نہ تو شمولیت کرتے ہیں نہ مجرم کی معاونت کرتے ہیں۔ ننواتے کے ضمن میں پٹکی (پگڑی) اور پڑونی (چادر) کو بھی اہم مقام حاصل ہے اور یہ دونوں پٹھان معاشرہ میں عزت و تکریم کی نشانیاں سمجھی جاتی ہیں۔ قبائلی معاشرہ میں خاندان یا قبیلے کا لاج رکھنے پر عموماً کہا جاتا ہے کہ "فلانی د

خاندان شملہ اوچت اوساتہ" یعنی فلانے شخص نے خاندانی عزت وقار کا طرہ سر بلند رکھا لیکن جب پٹھان صلح و آشتی کی خاطر اپنی پگڑی اتار کر مخالفین کے سامنے رکھ دیتا ہے تو پھر بغض وعناد اور دشمنی کی فولادی دیواریں ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر جاتی ہیں۔ اسی طرح جب ایک عورت اپنی چادر (پڑونی) یا جھولی دوسروں کے سامنے پھیلا دیتی ہے تو پھر ماضی کی رنجشیں قصہ پارینہ بن جاتی ہیں۔

پٹھانوں کے گھر میں جو کوئی بھی پناہ لیتا ہے اس کی ہر ممکن حفاظت کی جاتی ہے بعض موقعوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص نے اپنے والد یا بھائی کے قاتل کو نادانستہ طور پر پناہ دے دی اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ پناہ لینے والا شخص اسکے مقتول والد یا بھائی کا قاتل ہے تب بھی اس نے پناہ لینے والے شخص کو محفوظ مقام تک پہنچایا۔[1] پناہ لینے سے متعلق ناقابل فراموش مثالوں میں جوا کی آدم خیل آفریدی قبائل کی ایک مثال موجود ہے جنہوں نے چند مفروروں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ انگریزوں نے ان مفروروں کو حراست میں لینے کیلئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا لیکن جب دباؤ، لالچ اور دھونس سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے تو طاقت کے بل بوتے پر مفروروں کی گرفتاری عمل میں لانے کی کوشش کی۔ یہی وجہ تھی کہ ۷۸-۱۹۷۷ء میں کیل و کانٹے سے لیس پانچ ہزار انگریزی فوج نے علاقہ جوا کی پر حملہ کیا۔ حملہ آور فوج نے جوا کی قبائل کے گھر مسمار کر دیئے اور ان کی دوسری املاک کو نقصان پہنچایا لیکن مالی اور جانی نقصان کے باوجود ان لوگوں نے پناہ لینے والے مفروروں کی حوالگی پر رضامندی ظاہر نہیں کی۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے جارج۔ بی سکاٹ لکھتے ہیں کہ جوا کی زعماء نے انگریزوں کو صاف اور واشگاف الفاظ میں بتایا "ہم جرمانہ دیں گے، اپنا اسلحہ آپ کے حوالے کر دیں گے لیکن یہ دو آدمی جنہوں نے ہمارے ہاں پناہ لی ہے آپ کے حوالے نہیں کریں گے"۔ انہوں نے کہا "آپ نے ہمارے علاقے پر قبضہ کر لیا ہے اسے اپنے تصرف میں رکھیں ہم اپنے لئے کہیں اور گھر تلاش کر لیں گے لیکن پناہ لینے والوں کو کسی حالت میں آپ کے حوالے نہیں کریں گے"[2] دوسری مثال

عجب خان آفریدی کی ہے جس نے مس ایلس کے اغواء کے بعد تیراہ میں پناہ لی تھی۔ اسی سلسلہ میں انگریزوں نے ہر حربہ استعمال کیا لیکن تیراہ کے لوگ عجب خان اور مس ایلس کے اغوا میں ملوث دیگر افراد کی حوالگی پر آمادہ نہ ہوئے۔

آفریدی پناہ کے اصول پر جس سختی کے ساتھ کاربند رہے ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک غیرملکی مورخ لکھتا ہے "آفریدی ہر اس شخص کو پناہ دیتے ہیں جس نے دشمن یا قانون سے راہ فرار اختیار کی ہو۔ وہ ہر سختی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہر قسم کا نقصان برداشت کرتے ہیں لیکن پناہ لینے والے شخص کو کسی کے حوالے نہیں کرتے۔ یہ مہمان نوازی اس حد تک کی جاتی ہے کہ وہ پناہ لینے والے فرد کی حفاظت کیلئے سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں[۳]"۔

بدل

بزدلی پختونولی کی رو سے معیوب اور اپنے وقار کا دفاع آفریدیوں سمیت تمام پٹھانوں کی زندگی کا جوہر ہے اگر ان کے خاندان کا کوئی فرد قصداً کسی کے ہاتھوں مارا جائے تو وہ بدلہ لئے بغیر چھین سے نہیں بیٹھتے وہ ہر سختی کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ مہینوں بلکہ برسوں تک بدلہ لینے کی تاک میں رہتے ہیں اور ان کا جذبہ انتقام اس وقت تک ٹھنڈا نہیں ہوتا جب تک وہ کھلے بندوں بدلہ لے کر قبیلے میں سرفرازی کا مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ جو شخص بدلہ لینے میں ناکام رہتا ہے وہ اپنے ہم چشموں کے لعن وطعن کا شکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقتول کے لواحقین بدل کے چکر میں نتائج کی پرواہ نہیں کرتے۔

پشتو میں بدل کا مطلب انتقام ہے جو ذاتی، خاندانی یا قومی بھی ہو سکتا ہے۔ آفریدی بدلہ لینے کے سلسلہ میں قصاص یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کے اصول پر کاربند رہتا ہے

اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر قتل کا بدلہ قتل سے لے گا لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ آفریدی، سنگدل، ظالم اور خونخوار ہوتے ہیں۔ وہ انتقامی جذبات رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمدرد، بہی خواہ، شفیق اور مہربان بھی ہیں بشرطیکہ ان کی انا اور غیرت کو نہ للکارا جائے۔ وہ ہر اس شخص کو بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیتے جس کے ہاتھوں غلطی سے ان کا کوئی رشتہ دار مارا گیا ہو مگر وہ اس قتل پر خاموش نہیں رہ سکتے جو جان بوجھ کر کیا گیا ہو۔

علاقہ آفریدی میں قتل کا تصفیہ تین طریقوں سے کیا جاتا ہے پہلے یہ کہ مقتول کے ورثا کو قاتل اپنے خاندان کی ایک یا دو بالغ لڑکیاں بطور عوضانہ دے دیں اس کو پشتو میں سورہ کہتے ہیں۔ یہ لڑکیاں مقتول کے خاندان میں بیاہی جاتی ہیں اور اس طرح دشمنی دوستی میں بدل جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ مقتول کو عوضانہ دیا جائے جسے آفریدی ساز کہتے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی کے آوائل میں یہ رقم سینکڑوں میں تھی لیکن اب ہزاروں سے لاکھوں روپے تک پہنچ گئی ہے۔ تیسرا یہ کہ مقتول کے ورثا جذبہ در گزر سے کام لے کر قاتل کو بخش دیں۔ پٹھان معاشرہ میں بدلہ لینے کا حق مقتول کے خاندان کو پہنچتا ہے اور عموماً قاتل انتقامی کاروائی کا نشانہ بنتا ہے۔ اگر عرصہ دراز تک قاتل دشمن کے ہاتھ نہ آئے تو پھر اس کے بیٹے یا بھائی وغیرہ سے بھی بدلہ لیا جاتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مقتول کے رشتہ دار، اس کے والد، بھائی یا بیٹے کی مدد کرنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ بدل کے اس جنون نے خاندانی دشمنیوں کو رواج دیا ہے۔

آدم خیل قبائل میں بدلہ لینے کی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ماں کی پیٹ میں اور ماں کی گود میں شیر خوار بچوں نے جوان ہو کر اپنے والد کے قتل کا بدلہ لیا ہے۔ ایسا ہی واقعہ ۱۹۵۲ء میں درہ آدم خیل میں رونما ہوا تھا جب گاؤں بازی خیل کے ایک نوجوان نے جس کی ولادت اپنے والد کے قتل کے دو، تین ماہ بعد ہوئی تھی جوان ہو کر اس قتل کا بدلہ کھلے بندوں لیا اور اس مقصد کیلئے اپنی جان بھی داؤ پر

لگادی۔ آفریدیوں کے جذبہ انتقام کا ذکر کرتے ہوئے مسز سٹار لکھتی ہیں۔ایک دن ایک بوڑھا شخص جس کی نظر کمزور تھی آنکھوں کے علاج کیلئے مشن ہسپتال آیا۔جب اس کے معائنے کی باری آئی تو اس نے ڈاکٹر سے کہا "ڈاکٹر میں بوڑھا ہوں مگر مجھے میری نظر واپس لوٹا دو تاکہ میں بندوق چلا سکوں" ڈاکٹر کے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ سولہ سال سے اپنے بیٹے کے قتل کا بدلہ لینے میں نا کام رہا ہے۔[۴]

میلمستیا (مہمان نوازی)

آفریدیوں کے روایتی دستور و آئین میں میلمستیا کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر مستشریقین نے ان کے کردار کے اس پہلو کی بے حد تعریف کی ہے۔ان کے ہر گاؤں میں ایک حجرہ ہوتا ہے جہاں مہمانوں کا پر تپاک خیر مقدم کیا جاتا ہے۔صاحب خانہ اگر غریب ہو اور دنبہ ذبح کرنے کی استطاعت نہ رکھے تو مہمان کی ضیافت میں مرغ ضرور شامل کرتا ہے۔آفریدیوں کیلئے مہمان کے ساتھ راہ و رسم یا واقفیت کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی بلکہ اس کے ذہن میں مہمان کی خاطر تواضع کا خیال رہتا ہے اور وہ مہمان کیلئے دیدہ و دل فرش راہ ہوتا ہے۔مہمان کی آمد پر اسے "پہ خیر راغلے" (خوش آمدید) "ستڑے مہ شے" (آپ تھکے نہ ہوں)، "جوڑ ئے تکڑہ ئے" (آپ تندرست اور خوشحال ہیں)۔ "واڑہ زاگہ جوڑ دی" (چھوٹے بڑے سب ٹھیک ہیں) "پہ کور کلی کے خیریت دے" (گھر بار میں خیریت ہے) کے کلمات ان کی مہمان نوازی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔مہماں خواہ ایک ہی کیوں نہ ہو، گاؤں کے بیشتر افراد اس کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔اسی سلسلہ میں اولف کیرو لکھتے ہیں "پٹھانوں کے یہاں مہمان نوازی قومی اعزاز کا درجہ رکھتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔پٹھان کی سب سے بڑی توہین اس کے مہمان کو لے جانا ہے۔جو کوئی دوسرے کے مہمان کو اپنے ساتھ چلنے کو کہے وہ اس کے میزبان کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتا ہے۔برطانوی انصاف سے پہاڑوں میں چھپنے والے مفروروں کو بھی اسی طرح خوش آمدید

کہا جاتا تھا"۔ایک یورپی مصنف کی نظر میں "آفریدی زر (سونے) کی خاطر سب کچھ کرلیں گے لیکن مہمان کو ہر گز دھوکہ نہیں دیں گے۔جو کوئی ان کے گھر میں داخل ہوتا ہے وہ نہ صرف محفوظ رہتا ہے بلکہ اسے خندہ پیشانی کے ساتھ خوش آمدید بھی کہا جاتا ہے"۔[۵]

اعتبار

آفریدیوں کے غیر تحریری قوانین میں اعتبار کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے اور وہ اپنے عہد کی پوری پاسداری کرتے ہیں۔ان کے علاقہ میں تمام کاروبار بشمول خرید و فروخت جائیداد اعتبار یا اعتماد کی بنیاد پر ہوتا ہے۔یہاں تحریری معاہدوں کا رواج نہیں بلکہ سب کچھ قبائلی زعماء کی موجودگی میں زبانی طور پر طے کیا جاتا ہے اسلئے اعتبار شکنی پختونولی کے اصولوں کے منافی سمجھی جاتی ہے۔زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے باقی رسوم مندرجہ ذیل ہیں۔

بوتہ

بوتہ کے لفظی معنیٰ لے جانے کے ہیں لیکن یہ قرض یا بقایاجات کی وصولی کا ایک مخصوص طریقہ ہے مثال کے طور پر اگر ایک قرض خواہ کو مقروض سے اپنی رقم حاصل کرنے میں دشواری پیش آرہی ہو تو پھر وہ بوتہ کے ذریعے اپنی رقم کی واپسی کیلئے سعی کرتا ہے۔اس مقصد کیلئے وہ مقروض کا کوئی رشتہ دار یا اس کے مال مویشی اس وقت تک بطور یرغمال رکھتا ہے جب تک اس کی رقم ادا نہ ہو یا ایک معینہ مدت کے اندر اس کی ادائیگی کی ضمانت نہ ملے۔

بر آمتہ

بوتہ کی طرح بر آمتہ بھی ایک خاص مقصد کے حصول کا ایک مخصوص طریقہ ہے بر آمتہ لفظ بر آمد سے اخذ کیا گیا ہے۔ رسم بر آمتہ کے تحت ایک فرد یا افراد کو اس وقت تک بطور یرغمال رکھا جاتا ہے جب تک وہ مقصد حاصل نہ ہو جائے جس کیلئے بر آمتہ کیا گیا ہو۔ قبائل پر فوج کشی سے مثبت نتائج حاصل نہ ہونے کی صورت میں انگریز اکثر موقعوں پر ان کے خلاف بر آمتہ کا حربہ استعمال کرتے تھے۔ جب کبھی حکومت قبائل سے اپنی بات منوانے میں ناکام ہو جاتی تو بر آمتہ کے تحت اضلاع میں قبائل کی منقولہ اور غیر منقولہ املاک پر قبضہ کر لیتی تھی۔

بدرگہ

پناہ لینے والے فرد کو محفوظ مقام تک پہنچانے والی مسلح دستے کو بدرگہ کہتے ہیں۔ یہ عربی لفظ بدرقہ کی بدلی ہوئی صورت ہے جو بنیادی طور پر اسی مفہوم کا حامل ہے۔ علاقہ آفریدی میں انتقامی کاروائی کی خوف سے کوئی بدرگہ پر حملہ نہیں کرتا کیونکہ بدرگہ پر حملہ کرنے کی صورت میں متجاوزین سے انتقام لیا جاتا ہے۔ بالالفاظ دیگر بدرگہ اپنی قبائلی حدود میں پناہ لینے والے شخص کو حفاظت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

بونگہ اور بیلگہ

مال مسروقہ کو واگزار کرنے کے سلسلہ میں دی جانے والی رقم کو بونگہ کہتے ہیں۔ بالالفاظ دیگر مال مسروقہ یا اغوا کے عوض طلب شدہ رقم کو بونگہ کہتے ہیں۔ پشتو میں بیلگہ مسروقہ مال کیلئے استعمال کیا جاتا

ہے۔ قبائلی رسم کے مطابق وہ شخص چوری، ڈاکہ زنی یا نقب زنی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے جس کے قبضے سے مسروقہ مال بر آمد کیا جائے تاہم چوری میں ملوث افراد کی نشاندہی کرنے پر اسے بیلگہ یا دعویٰ سے مستثنی قرار دیا جاسکتا ہے۔

بدنڑ

بدنڑ کے معنی 'بندش' کے ہیں لیکن عام اصطلاح میں یہ درختوں کی کٹائی پر پابندی عائد کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بدنڑ کے ذریعے جنگلوں اور پہاڑوں سے لکڑی کاٹنے کی ممانعت کی جاتی ہے اور جو بھی اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتا پایا جائے اس سے مقررہ ناغہ (جرمانہ) وصول کیا جاتا ہے۔

بلندرہ

باہمی تعاون اور اپنی مدد آپ کے جذبے کے تحت ایک دن میں کسی کام کو سرانجام دینے کو بلندرہ کہتے ہیں۔ یہ رسم آشر کے نام سے بھی مشہور ہے۔ فصلوں کی بوائی یا کٹائی اور گہائی کے وقت گاؤں کے لوگ بلندرہ کے تحت بلامعاوضہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

پیغور

پٹھان روایات کے برعکس کسی کو اپنے مقتول والد یا بھائی کا بدلہ نہ لینے یا کسی کو اپنے آبرو اور وقار کے دفاع کے سلسلہ میں ناکامی کا طعنہ دینے کو پیغور کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی بزدلی پر طنز کرنے کو پیغور کہتے ہیں۔ قبائلی علاقہ میں پیغور دنگہ اور فساد کا سبب بنتا ہے۔

چیغہ

دشمن کا تعاقب کرنے والی پارٹی کو چیغہ کہتے ہیں۔ پشتو میں چیغہ چیخ یا شور وغل کو کہتے ہیں لیکن چیغہ مختصر نوٹس پر اس وقت ترتیب دیا جاتا ہے۔ جب ڈاکو، چور یا مسلح افراد گاؤں یا قبیلہ کے مال مویشی ہنکالے جانے، لوٹ مار کرنے یا کسی فرد کو اغوا کرنے کی نیت سے آئے ہوں۔ چیغہ پارٹی لشکر کی طرح مسلح افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور حملہ آوروں سے مال مویشی چھڑانے یا مسروقہ مال برآمد کرنے کیلئے بھیجی جاتی ہے۔

ست

کھانا کھانے کے وقت موقع پر موجود افراد کو کھانے کی دعوت دینا ست کہلاتا ہے۔ آفریدی ست کے بغیر شادی بیاہ یا دیگر دعوتوں میں شرکت کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

ساز

علاقہ آفریدی میں ساز کا لفظ خون بہا کیلئے استعمال ہوتا ہے اور ایسے جھگڑوں کا فیصلہ جن میں جانیں تلف ہوئی ہوں، ساز کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اگر قتل کی صورت میں کوئی فرد اپنے کئے پر پشیمانی کا اظہار کرنے کے بعد جرگے کے ذریعے خون بہا کی ادائیگی پر آمادگی ظاہر کرتا ہے تو پھر ساز کی رقم قبول ہو جانے پر فریقین میں دشمنی ختم ہو جاتی ہے۔

لخکر

لخکر جسے عرف عام میں لشکر کہا جاتا ہے مسلح افراد کے اس گروہ کو کہتے ہیں جسے پرامن مقاصد کی تکمیل کیلئے ترتیب دیا جائے۔ حسب ضرورت لشکر دو تین درجن یا سینکڑوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے جس طرح اضلاع میں امن وامان کی ذمہ داری پولیس کے فرائض منصبی میں شامل ہے اسی طرح لشکر بھی امن وامان قائم کرنے اور جرگے کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دیتا ہے۔ اگر کوئی فریق جرگے کا فیصلہ تسلیم کرنے کے بعد عہدشکنی کا مرتکب پایا جائے تو اس کے خلاف لشکرکشی کی جاتی ہے۔

لوخے

لوخے ورکول کے لفظی معنی 'برتن دینے کے ہیں لیکن اس رسم کی رو سے ایک فرد یا قبیلے کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنا ہوتا ہے۔ قبائلی علاقہ میں کمزور قبیلہ اپنی حفاظت کیلئے اپنے طاقتور ہمسایہ قبیلے کو لوخے دیتا ہے جو عموماً دنبے کی شکل میں قبول کیا جاتا ہے۔ ایک بار جب لوخے قبول کیا جائے تو پھر لوخے لینے والے قبیلے پر لوخے دینے والے قبیلے کی حفاظت کی ذمہ داری لازم ہو جاتی ہے جو ہر قیمت پر پوری کی جاتی ہے۔ یہ رسم آفریدی اور اورکزئی قبائل میں موجود ہے۔

ملاتڑ

ملاتڑ کے معنی 'کمر کسنے کے ہیں لیکن یہ اصطلاح ایک خاندان یا قبیلے کے مسلح افراد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قبائلی پٹھان یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ "ا" کے پاس دس

آدمیوں کا ملاتڑ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "ا" کے پاس اپنے قریبی رشتہ داروں پر مشتمل دس افراد کا ایک مسلح گروہ موجود ہے۔ جارحیت کے مرتکب افراد کے خلاف مسلح دستہ بھیجنے کو بھی ملاتڑ کہتے ہیں۔

گندی

موجودہ دور میں دنیا کے ممالک اپنی علاقائی سالمیت اور آزادی کے دفاع کیلئے دو طرفہ معاہدے کرتے ہیں اسی طرح قبائلی علاقہ میں بھی مختلف دیہات اپنے مشترکہ مفادات کے تحفظ کیلئے آپس میں دفاعی نوعیت کے معاہدے کرتے ہیں جنہیں گندی کہا جاتا ہے۔ گندی سے منسلکہ فریق پر حملہ گندی میں شامل تمام افراد پر حملہ تصور کیا جاتا ہے اور ایسی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مالی، اخلاقی اور عملی مدد کرتے ہیں۔

تور

تور کے معنی 'سیاہ ہیں لیکن اصطلاحی طور پر یہ لفظ سیاہ کاری کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جب کسی مرد کی وجہ سے عورت کی عصمت داغدار ہو جائے تو پھر یہ تور کہلاتا ہے۔ خاتون کی عصمت پر حملہ کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانے کیلئے خاتون کے خاندان کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تور کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ کوئی شخص کسی پاک دامن خاتون کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں عورت بے قصور سمجھی جاتی ہے اور دست اندازی کرنے والا شخص قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے جسے قبائلی روایات کے مطابق سزا وار قتل گردانا جاتا ہے۔ ہاں اگر تور کے الزام میں ملوث افراد کے والدین اور رشتہ دار اسکی پشت پناہی پر اتر آئیں اور اسے اپنے گھر سے خارج کرنے میں

لیت و لعل سے کام لیں تو پھر عورت کے شوہر، باپ یا بھائی کو بذات خود ملزم کو یا اس کے قریبی رشتہ داروں وغیرہ کو قتل کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

تور کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی مرد نے ایک خاتون کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کئے ہوں ایسی صورت میں مرد اور عورت دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے ڈانلڈ لکھتے ہیں کہ آدم خیل آفریدیوں کے ساتھ اپنے دس سالہ تعلقات میں تور کے ایک ایسے واقعہ سے آگاہ ہوں جس میں مرد اور عورت دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ اخلاقی لحاظ سے تمام پٹھانوں میں سرفہرست ہیں۔[ح۶] تور کا الزام لگنے کے بعد ملزم کے خاندان کا یہ اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ ملزم کو خاتون کے شوہر یا قریبی رشتہ داروں کے حوالے کریں لیکن اگر اس اصول کو نظر انداز کیا جائے تو پھر ملزم کے خاندان کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی عورت کے رشتہ داروں کو اپنی عزت کا بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہوتا ہے۔ ملزم کے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں اس کے باپ یا بھائی وغیرہ کو بھی انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اگر عورت کا خاندان عورت کو زندہ چھوڑ کر مرد کو ہلاک کر دے تو پھر مقتول کے رشتہ داروں کو بھی بدلہ لینے کا حق پہنچتا ہے۔ قبائلی رواج کے مطابق مجرم کو عورت کے خاندان کے حوالے کیا جاتا ہے اور اس طرح وہ ذلت اور رسوائی کی موت مرجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبائلی علاقہ میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی با رسوخ کیوں نہ ہو اس قسم کی سنگین سزا کی خوف سے عورت کو گناہ آلود نظروں سے دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

تڑ

قبیلے یا گاؤں کے لوگوں کے درمیان ایک خاص مقصد کیلئے عہد نامے کو تڑ کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر فصل کے بوائی کے بعد گاؤں کے لوگ یہ عہد کرتے ہیں کہ مال مویشی کو ملحقہ کاشت شدہ

کھیتوں میں چرنے نہیں دیا جائیگا۔ اس فیصلے کے بعد اگر کھیت کے مالک کے ہاتھوں کھیت میں چرنے والے مویشی کو گزند پہنچ جائے تو مویشی کے مالک کو نقصان طلب کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کسی کے ساتھ ایک خاص مقصد کے حصول کیلئے عہد کو بھی تڑ کہتے ہیں۔

باب دہم

پیدائش، شادی اور موت سے متعلق رسوم

پیدائش

قبائلی علاقہ کے مخصوص حالات اور احساس تحفظ کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی بنا پر افرادی قوت کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے لہذا لڑکی کی بہ نسبت لڑکے کی پیدائش پر زیادہ خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ آفریدی معاشرہ میں لڑکا ایک معاشرتی سرمایہ سمجھا جاتا ہے جو خاندان کیلئے وجہ شہرت بن سکتا ہے۔ وہ ایک پوری نسل کی بنیاد رکھتا ہے اور خاندان کی سماجی حیثیت کو استحکام بخشتا ہے اسلئے لڑکی پر اسے فوقیت دی جاتی ہے۔ اگر کسی کے ہاں طویل عرصہ کے بعد لڑکا پیدا ہو تو عزیز واقارب ہوائی فائرنگ کے ذریعے اس کی ولادت پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے موقع پر اس کے والدین دل کھول کر رقم خرچ کرتے ہیں۔

آفریدی قبائل میں لڑکی کی پیدائش پر کوئی خوشی نہیں منائی جاتی بلکہ بعض اوقات اولاد نرینہ سے محروم مائیں لڑکی کی پیدائش پر آنسوں بہاتی ہیں اور اپنی بدبختی کا رونا روتی ہیں یہ اسلئے کہ لڑکا مرد کا بازو بنتا ہے اور لڑکی ایک کمزوری اور مجبوری۔ بچے کی ولادت کے فوراً بعد گاؤں کا پیش امام یا کوئی پرہیزگار شخص اسلامی روایات کے مطابق اس

کے کان میں اذان دیتا ہے اور بچے کو گھٹی (آ) بھی دی جاتی ہے۔ چند دنوں کے اندر بچے کا نام تجویز کیا جاتا ہے جو پیغمبروں یا صحابہ کرام کے ناموں سے مشابہ ہو۔ نام کے آخر میں عموماً خان کا لفظ لگایا جاتا ہے۔

بچے کی پیدائش کے بعد زچہ و بچہ کو جنات سے بچانے کی غرض سے احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ بچے کے سرہانے چاقو، چھری یا تیز دار آلہ رکھا جاتا ہے تاکہ اس کے خوف سے بدروحیں اس سے دور ہوں اور وہ زچہ و بچہ کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ بچے کی ماں کو جنات کے خوف سے تقریباً چالیس روز تک اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔ زچہ ایک دو ہفتے کام بھی نہیں کرتی البتہ چالیس دنوں کے بعد وہ گھر کا کام کاج باقاعدہ کرنے لگتی ہے۔ اگر خاندان میں بہت عرصہ کے بعد لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کے داہنے کان میں سوراخ کر کے سونے یا چاندی کا چھلا ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ نظر بد سے محفوظ رہے۔

سر کلے

بچہ چالیس دن کا ہو جائے تو اس کے سر کے بال مونڈوائے جاتے ہیں۔ پشتو میں اس رسم کو "سر کلے" کہتے ہیں۔ سر کلے کی رسم گاؤں کے حجام کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اسی موقع پر بچے کے والدین اپنی استطاعت کے مطابق حجام کو کچھ نقد رقم پیش کرتے

(آ) گھٹی چند اجزاء پر مشتمل ایک تحلیل شدہ مرکب ہوتا ہے جو کسی صاحب اولاد خاتون کے ہاتھوں بچے کو پلائی جاتی ہے۔

ہیں جب بچہ ڈیڑھ دو سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اسلامی طریقہ کے مطابق اس کی ختنہ کی جاتی ہے۔

سونت

پشتو میں ختنہ کو سنت کہتے ہیں۔ آفریدیوں کے علاقہ میں ختنہ کی رسم سادہ طریقے سے ادا ہوتی ہے اور بعض پٹھانوں کے برعکس اس موقع پر نہ تو ناچ گانے کا پروگرام ہوتا ہے اور نہ بچے کو دولہا کی طرح سجا کر اور گھوڑے پر بٹھا کر گلی کوچوں میں پھرایا جاتا ہے البتہ اسے نئے کپڑے پہنادیئے جاتے ہیں۔ اسے خانک پر بٹھایا جاتا ہے اور حجام اسے بہلا پھسلا کر ختنہ کی کاروائی مکمل کرتا ہے۔ اسی موقع پر برادری اور گاؤں والوں کی طرف سے بچے کو کچھ رقم دی جاتی ہے اور محدود پیمانے پر ضیافت کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

بچہ جب گھومنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اسے گاؤں کے پیش امام کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے کیلئے مسجد میں بھیجا جاتا ہے۔ اسے پہلے کلمہ طیبہ، بعد میں نماز، تلاوت قران پاک اور اسلام کے دیگر بنیادی اصول پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں۔ پانچ، چھ سال کی عمر میں بچہ سکول جانے لگتا ہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود کے میدان میں بھی قدم رکھتا ہے پہلے وہ کشتی اور جسمانی ورزش میں دلچسپی لیتا ہے پھر غلیل سے پرندوں کا شکار کھیلتا ہے اور جوان ہو کر بندوق کو اپنے گلے کی زینت بنا لیتا ہے۔ وہ روزمرہ کے کام کاج میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے اور اسی طرح بیٹی گھریلو کام کاج میں ماں کی مدد کرتی ہے۔

منگنی

آفریدیوں میں منگنی سے متعلق جو پرانی رسم موجود تھی اسے پشتو میں "لمن شلول" (دامن چھیرنا یا پھاڑنا) کہتے تھے۔ یہ ایک لڑکی کو زبردستی اپنے نام سے منسوب کرنے کا طریقہ تھا۔ اس رسم کے تحت جو عورت نوزائیدہ بچی کا دامن پہلے پھاڑ دیتی تھی۔ اس پر اس کا دعویٰ تسلیم کیا جاتا تھا اور کسی دوسرے گھرانے کو اس لڑکی کا رشتہ مانگنے کا حق حاصل نہیں ہوتا تھا مگر اس رسم کے تحت شادی عموماً قریبی رشتہ داروں میں ہوا کرتی تھی فروغ تعلیم کے ساتھ اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ دوسری رسم "نیوکہ" کہلاتی ہے جس کا مطلب کسی لڑکی پر اپنا حق جتانا ہوتا ہے۔ اس رسم کی رو سے ایک شخص علی الاعلان ایک لڑکی پر اپنا حق جتاتا ہے۔ اگر گاؤں یا قبیلے کا دوسرا فرد دعویٰ کرنے والے شخص کی مرضی کے خلاف اس لڑکی کا رشتہ مانگنے کی خواہش کرے تو وہ ایسی کوشش کو اپنی حق تلفی کے مترادف سمجھتا ہے اور بعض اوقات اس معاملے پر بات دشمنی تک پہنچ جاتی ہے۔ نیوکہ کے رسم کے تحت بھی شادی عموماً قریبی رشتہ داروں میں ہوتی ہے مگر تعلیمی ترقی کے ساتھ یہ رسم بھی دم توڑ رہی ہے۔

بعض اوقات ایک شخص اپنی چھوٹی بچی کو اپنے بھائی یا عزیز کے بچے سے منسوب کر دیتا ہے جسے پشتو میں وینا کہتے ہیں۔ گویہ نسبت غیر رسمی ہوتی ہے مگر اسی ضمن میں فریقین اپنے عہد کا پورا پورا پاس کرتے ہیں۔ آفریدی رشتے کے انتخاب کے موقع پر ایسے خاندان کو ترجیح دیتے ہیں جو باعزت اور بارسوخ ہونے کے ساتھ ساتھ انفرادی لحاظ سے بھی طاقتور ہو یعنی رشتہ کرتے وقت خاندانی وقار اور انفرادی قوت کو ترجیح دی جاتی ہے تاکہ

ضرورت پڑنے پر وہ ان کے کام آسکیں۔ آدم خیل میں وٹہ سٹہ یا ادلے بدلے کی شادی کا رواج بھی ہے۔ لڑکی والے جب لڑکی دیتے ہیں تو بدلے میں ان کی لڑکی مانگتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح ان کی بیٹی کو پرسکون زندگی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ آدم خیل خاندانی پس منظر اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ لڑکی کے حسن اخلاق کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ پٹھانوں کی شعروشاعری رومانی جذبات سے بھرپور ہے لیکن آفریدی معاشرہ میں محبت کی شادی نہ صرف ناپید ہے بلکہ لڑکی سے اظہار محبت پر معاملہ دشمنی تک پہنچ جاتا ہے۔

لڑکے کے یا لڑکی کی ازدواجی زندگی کا فیصلہ والدین کرتے ہیں۔ رشتہ طے کرنے میں عموماً خاندان کے بزرگوں کی روایات اور ان کی مرضی کا عمل دخل ہوتا ہے اور لڑکے یا لڑکی کی پسند کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ منگنی کی گفت وشنید ہمیشہ لڑکے والوں کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ جب لڑکے کے خاندان کو اپنے گاؤں یا آس پاس کے دیہات میں پسندیدہ رشتہ مل جائے تو دولہا کے والدین براہ راست یا گاؤں کے معززین کی وساطت سے لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں۔ خوب چھان پھٹک کے بعد جب لڑکی کے والدین کو اطمینان ہوتا ہے کہ لڑکی کیلئے رشتہ مناسب ہے تو وہ لڑکے کے گھر والوں کو ہاں کر دیتے ہیں۔ اس موقع پر شادی سے متعلق شرائط "سر" کی رقم اور پسول کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔ (آ) رشتہ طے پا جانے پر لڑکی کے ورثا حجرہ میں موجود معززین کے سامنے رشتہ دینے کا اقرار کرتے ہیں اور

(آ) پشتو میں زیورات کو پسول کہتے ہیں۔ آدم خیل کے پسول میں عموماً ٹکہ، چوڑیاں، انگوٹھیاں، پازیب اور جھمکے شامل ہوتے ہیں۔

دعائے خیر کی جاتی ہے۔ سر کی رسم کے تحت جو "ولور" بھی کہلاتا ہے۔ لڑکے کے والدین سے چند ہزار سے لے کر ایک لاکھ تک نقد رقم لی جاتی ہے۔ قریبی رشتہ داروں میں شادی ہونے کی صورت میں سر کی رقم معمولی جبکہ غیر رشتہ داروں میں زیادہ ہوتی ہے۔ شہر کے لوگ اس رسم کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اسے ایک تجارتی لین دین سے کم نہیں سمجھتے لیکن سر کی رقم لینے کا مطلب یہ نہیں کہ قبائلی علاقہ میں عورتوں کو مول لیا جاتا ہے بلکہ اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ شادی کے سلسلہ میں لڑکی کے والدین کی مالی معاونت کی جائے تاکہ وہ لڑکی کیلئے با آسانی زیورات، خانہ داری کے لوازمات اور کپڑے خرید سکیں۔ لڑکی کے سر پر رقم لینا عزت اور وقار کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور جس لڑکی پر جتنی زیادہ رقم لی جائے اسے سسرال میں اتنی ہی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ مالدار لوگوں کو بیٹی کے سر پر رقم لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی لیکن وہ بھی اسی وجہ سے کچھ نہ کچھ رقم ضرور لیتے ہیں البتہ اب متمول اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں نہ تو لڑکے والوں سے رقم وصول کی جاتی ہے اور نہ ورییجے غوڑی (چاول اور گھی) (آ) کیلئے رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اگر سر کی رقم کے ساتھ شہری علاقوں میں جہیز کی مروجہ رسم کا موازنہ کیا جائے تو یہ رسم جہیز کے مقابلہ میں برے اثرات کی حامل دکھائی نہیں دیتی۔ جہیز ایک معاشرتی مسئلہ بن گیا ہے جس کی لپیٹ میں اس وقت پورا معاشرہ آچکا ہے۔ بہت سی باشعور اور قبول

(آ) ورییجے غوڑی سے مراد دولہا کی طرف سے دلہن کے گھر والوں کے مہمانوں کو کھانا کھلانا ہے۔

صورت بیٹیاں صرف جہیز نہ ہونے کے باعث بابل کی دہلیز پر بیٹھی ہیں جبکہ دوسری طرف علاقہ آفریدی میں جوان لڑکیاں بیس سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی بیاہی جاتی ہیں اور وہاں ان کو ان مسائل سے دوچار ہونا نہیں پڑتا جو شہری علاقے کے لوگوں کو درپیش ہیں۔

منگنی کا اعلان حجرے میں کیا جاتا ہے اور اس موقعہ پر موجود لوگوں میں مونگ پھلی اور مٹھائی وغیرہ تقسیم کی جاتی ہے۔ منگنی کے بعد لڑکی منگیتر کے والدین، بہنوں اور بھائیوں سے پردہ کرنے لگتی ہے۔ پہلی عید کے موقع پر سسرال والوں کی طرف سے لڑکی کو ایک ریشمی جوڑا اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ بھیجی جاتی ہے۔ عید کے موقعوں پر تحائف کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ منگنی کے بعد لڑکی کے گھر پہلی دفعہ جانے کو پخہ ازادہ یا "پخہ آرتہ" (لفظی معنی 'پاؤں کھولنا) کہتے ہیں۔ اس رسم کے تحت منگیتر کے والدین لڑکی کی گھر جاتے ہیں اور اسے ریشمی جوڑا، سونے کی انگوٹھی یا کوئی اور زیور دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کے درمیان آزادانہ میل جول اور آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

شادی

منگنی کے کچھ عرصہ بعد شادی ہوتی ہے جو عموماً جمعرات یا اتوار کے روز کی جاتی ہے۔ شعبان کے مہینے میں شادی کرنے کا رواج عام ہے۔ شادی کی مقررہ تاریخ سے دو تین دن قبل گاؤں میں شادی کی تقریبات شروع ہو جاتی ہیں اسے پشتو میں سندرے کیخودل کہتے ہیں۔ اس رسم کے تحت تقریباً تین راتیں خواتین طربیہ گیت گاتی ہیں اور رات کے سکوت کو چیرتی ہوئی مترنم آوازیں عجیب رس گھولتی ہیں۔ مقررہ تاریخ سے ایک دن قبل دولہا کے اعزہ واحباب اس کے گھر پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ شادی کی رات کو مہندی لگانے کی رسم ادا

کی جاتی ہے جسے پشتو میں نکریزے کہتے ہیں۔ مہندی کو ایک تھال میں گھول کر اس میں رنگ برنگے کاغذی پھول اور موم بتیاں لگائی جاتی ہیں اور لڑکے والیاں تھال کو اٹھا کر گیت گاتی ہوئی دلہن کے گھر میں داخل ہوتی ہیں اور لڑکی کو مہندی لگاتی ہیں۔ یہ رسم عموماً تین چار عمر رسیدہ خواتین کے ہاتھوں انجام پاتی ہے۔ اس کے بعد دلہن کے سر کے بالوں کو سنوارا جاتا ہے۔ اور سیدھی مانگ نکال کر اس میں سندور ڈالی جاتی ہے۔ یہ کام عموماً کسی نیک اور صاحب اولاد خاتون کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکے کی مالی حالت اچھی ہو تو شادی دھوم دھام کے ساتھ رچائی جاتی ہے اور رات کو موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے لیکن اب درہ آدم خیل میں ناچ گانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

دولہا دو وقت یعنی شام اور دوپہر مہمانوں کو کھانا کھلاتا ہے اور دلہن کے گھر والوں کی طرف سے مہمانوں کی خوراک کا انتظام بھی دولہا کو کرنا پڑتا ہے اسے پشتو میں وریجے غوڑی کہتے ہیں یعنی دعوت طعام کا انتظام دلہن والے کرتے ہیں لیکن خرچہ دولہا والے برداشت کرتے ہیں۔ اگر دولہا فارغ البال ہو تو پھر ولیمہ میں پلاؤ، مرغ اور ترکاریاں بھی شامل ہوتی ہیں لیکن عام طور پر اسی موقع پر موٹے چاول پکائے جاتے ہیں۔

شادی کی تقاریب میں بارات کو نقطہ عروج کی حیثیت حاصل ہے۔ علاقہ آفریدی میں خواتین کی بارات کو "ورا" کہتے ہین۔ مقررہ تاریخ پر عموماً دن کے گیارہ بجے بارات بڑی سج دھج سے دولہا کی گھر سے روانہ ہوتی ہے اور گھر عورتوں سے خالی ہو جاتا ہے البتہ ایک دو عمر رسیدہ خواتین گھر کی رکھوالی کیلئے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ بارات دف اور ڈھولک کی تھاپ اور دوشیزاؤں کے نعروں اور خوشی کے نغمات کی گونج میں روانہ ہوتی ہے۔ بارات جونہی لڑکے کی گھر پہنچتی ہے تو گاؤں والے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ مرد حجرے میں بیٹھ جاتے ہیں جبکہ عورتیں

دلہن کے گھر کے صحن مین جمع ہو جاتی ہیں اور کورس یا دو گانے کی صورت میں گیت گاتی ہیں۔ بعض اوقات دس، بارہ عورتیں جھومر یا دائرے کی صورت میں لوک ناچ پیش کرتی ہیں جسے "بلبلہ" کہا جاتا ہے۔

بارات کے پہنچنے سے قبل دلہن کو عروسی جوڑا جو عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے پہنایا جاتا ہے اور اس کی سہیلیاں گیت گاتے وقت اس کے حسن و اخلاق کی تعریف کرتی ہیں۔ شادی کی رسوم میں نخہ (نشانہ بازی) کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ نکاح سے قبل "جنج" یا بارات میں شریک افراد کو نشانہ بازی کی دعوت دی جاتی ہے۔ نشانہ لڑکی والوں کی طرف سے ایک پیچیدہ جگہ میں رکھا جاتا ہے جہاں وہ آسانی سے گولی کی زد میں نہیں آسکتا۔ لیکن دوسری طرف دولہا کے رشتے دار پہلے ہی سے انتظام کر چکے ہوتے ہیں اور وہ اچھے نشانہ بازوں کو شادی میں شمولیت کی دعوت دیتے ہیں۔ جو شخص نشانہ مار گراتا ہے اسے دولہا کی طرف سے ایک لنگی (پگڑی) بطور انعام دی جاتی ہے۔ نشانہ بازی کے بعد باراتی گاؤں کی مسجد میں نکاح کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ پیش امام نکاح پڑھاتا ہے اور دلہن، دولہا کے بھائی، چچا یا برادر نسبتی وغیرہ کا نام بطور پدر نکاح تجویز کرتی ہے پدر نکاح کا درجہ حقیقی والد کے برابر سمجھا جاتا ہے اور وہ لڑکی کے حقوق کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

نکاح کے موقع پر دولہا کے دوست اور رشتہ دار اسے کچھ رقم بطور "نیندرہ" دیتے ہیں۔ نیندرہ ایک قسم کی عارضی مالی مدد ہوتی ہے جو شادی کے موقع پر دولہا کو دی جاتی ہے۔ "نیندرہ" کے طور پر دی ہوئی رقم کا ریکارڈ ایک نوٹ بک میں محفوظ کر لیا جاتا ہے تاکہ ان کے ہاں شادی کے موقع پر اتنی یا اس سے زیادہ رقم بطور نیندرہ دی جاسکے۔ یہ رقم پانچ روپے سے لے کر سینکڑوں تک ہوا کرتی ہے۔ بیشتر موقعوں پر نیندرہ کی مجموعی رقم ہزاروں روپے

تک پہنچ جاتی ہے نکاح کے بعد دولہا کو سسرال کی طرف سے نئے کپڑے، کلاہ لنگی یا قراقلی ٹوپی دی جاتی ہے۔

دلہن کو عزت واحترام کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔ جس وقت اسے ڈولی میں بٹھایا جاتا ہے تو وہ اپنا آبائی گھر چھوڑنے پر روتی ہے۔ اس وقت اس کا والد یا بھائی اسے سہارا دے کر ڈولی میں بٹھاتے ہیں اور اس کے بعد اسے دولہا کے رشتہ داروں کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ دلہن کو موٹر یا لاری میں بٹھاتے وقت موٹر کے اوپر مٹھیاں بھر بھر کر پیسے نچھاور کئے جاتے ہیں۔ دلہن کی گاؤں سے لے کر دولہا کی گھر تک باراتی راستے میں ہوائی فائرنگ کرتے ہیں اور عورتیں خوشی کے نغمے گاتی ہیں۔ بارات کی واپسی پر گاؤں کے نوجوان ڈولی کو کندھا دینے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اس میں بھی روپوں کا سوال ہوتا ہے۔ گاؤں کے نوجوان اس وقت تک ڈولی زمین پر نہیں رکھتے جب تک انہیں منہ مانگی رقم بطور انعام ادانہ کی جائے اسکے بعد دلہن کو ایک سجے سجائے پلنگ پر بٹھایا جاتا ہے۔ عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں اور دلہن کا نقاب اٹھا کر رسم رونمائی ادا کرتی ہیں۔ سب سے پہلے ساس یا دولہا کی بہنیں دلہن کا چہرہ دیکھتی ہیں اور ان کے بعد باری، باری عزیز واقارب اور دوسری عورتیں دلہن کو نقدی کی صورت میں سلامیاں دیتی ہیں۔ اس موقع پر دلہن کو جو رقم دی جاتی ہے اہل خانہ اس کا بھی باقاعدہ ریکارڈ رکھتی ہین تا کہ متعلقہ خواتین کے گھر میں شادی بیاہ کے موقع پر اتنی رقم پیش کی جاسکے۔ رقم پیش کرنی والی عورتوں کو لڑکے والوں کی طرف سے دوپٹے دئے جاتے ہیں۔ شادی کے اختتام سے قبل گاؤں کے لوگ حجرے میں جمع ہوتے ہیں دولہا اور اس کے والد کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور حاضرین میں مونگ پھلی، ریوڑیاں، بھنے ہوئے مکئی کے دانے یا مٹھائی وغیرہ تقسیم

کی جاتی ہے۔ اس رسم کو مقامی اصطلاح میں خانئی کہتے ہیں۔

آفریدیوں کی شادی کا ایک الگ حسن ہے اور یہاں شادی کی تمام رسمیں اسلامی روایات کے مطابق ادا کی جاتی ہیں۔ شادی دن کے اجالے میں کی جاتی ہے۔ دلہن کو اسلامی طریقے کے مطابق حق مہر دیا جاتا ہے اور بعض علاقوں کی طرح دولہا سے ہزاروں روپے کا جیب خرچ، بیس تیس تولے سونا، درجنوں قیمتی کپڑے، لاکھوں روپے کی مالیت کے مکان اور لاکھوں روپے کے حق مہر کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان رسومات کی عدم موجودگی میں قبائلی علاقہ میں عموماً شادیاں کامیاب ہوتی ہیں اور یہاں نوبت ناچاقی اور طلاق تک نہیں پہنچتی۔

کچھ عرصہ قبل شادی کی تقاریب میں شمولیت کیلئے دعوتی کارڈوں کا رواج نہیں تھا اور یہ کام گاؤں کے حجام سرانجام دیتے تھے لیکن اب دعوتی کارڈوں کا رواج عام ہو گیا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ شادی کے سلسلہ میں آدم خیل اپنے خاندان یا قبیلے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اکثر لڑکیاں اپنے ہی قبیلے میں بیاہی جاتی ہیں۔ شادی کے اس فریضہ میں ایسی لڑکیاں اور لڑکے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں جو پہلے سے ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن شادی کا یہ بندھن عمر بھر رہتا ہے۔ علاقہ آفریدی میں کمسنی میں شادیاں کرنے کا رواج نہیں ان کے ہاں ایک سے زائد شادیاں کرنے کا رواج بھی عام نہیں البتہ وہ اس وقت دوسری شادی کرتے ہیں جب پہلی بیوی بے اولاد ہو اور یا میاں بیوی کے مابین شدید نوعیت کے اختلافات ہوں۔ آدم خیل میں طلاق کا رواج بھی عام نہیں بلکہ اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور زن طلاق ناقابل برداشت گالی سمجھی جاتی ہے اور اس پر بات قتل تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں وٹہ سٹہ کی شادیاں بھی مروج ہیں۔

آفریدی اپنی بیوہ بھاوج کے ساتھ شادی کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں لیکن بیوہ کو دوسری شادی کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ ویسے صاحب اولاد بیوہ خواتین باقی عمر کیلئے غیر شادی شدہ رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

موت

آفریدیوں میں ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے اسلئے وہ اپنے عزیز واقارب کے غم میں شریک ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ موت کی خبر سنتے ہی قبیلے کے جوان قبر کھودنے کیلئے قبرستان اور سفید ریش غمزدہ خاندان سے تعزیت کیلئے گاؤں کے حجرے میں پہنچتے ہیں اس طرح اڑوس پڑوس اور قرب وجوار کی عورتیں گڑ، چینی، چاول یا گندم کی گٹھڑیاں لئے میت کے گھر جاتی ہیں اور پسماند گان کے غم میں شریک ہو کر ان کی دلجوئی کرتی ہیں۔

میت کو گھر کے صحن میں ایک چارپائی پر رکھا جاتا ہے۔ عورتیں اس کے اردگرد بیٹھ جاتی ہیں اور میت کے قریبی رشتہ داروں مثلاً ماں، بیوی، بہنوں سے گلے مل کر روتی ہیں اور نوحہ خوانی کے دوران دلدوز انداز میں میت کی خوبیاں گنواتی ہیں۔ یہ ایک ایسا دلگداز منظر ہوتا ہے جسے دیکھ کر پتھر دل بھی موم ہو جاتا ہے اور انکھوں سے غیر ارادی طور پر انسو ابل پڑتے ہیں۔ آہ وبکا کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہتا ہے۔

"ویر" یا بین کرنا بھی گریہ زاری کا ایک مخصوص طریقہ ہے بعض اوقات غم سے نڈھال عورتیں اپنے ہاتھوں سے منہ سر یا سینہ پیٹنا شروع کرتی ہیں۔ سینہ کوبی اور بین کرتے وقت میت کی رشتہ دار خواتین خود بھی زاروقطار روتی ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتی

ہیں لیکن آج کل ویر کو ایک معیوب رسم سمجھا جاتا ہے اور بہت کم موقعوں پر یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر دوپہر سے قبل کسی کی موت واقعہ ہو جائے تو اسے اسی دن دفنایا جاتا ہے بصورت دیگر اگلی صبح کو میت کی تجہیز وتکفین ہوتی ہے۔

میت کے گھر میں سوگ کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ چالیس روز تک ہوتا ہے اور بعض حالات میں شدید صدمے کی وجہ سے یہ سوگ وقفے وقفے سے کئی ہفتوں تک جاری رہتا ہے۔ اسی دوران گاؤں کے لوگ پسماند گان سے اظہار ہمدردی کے طور پر شادی بیاہ نہیں رچاتے اور اگر ایسی تقریب منعقد کرنا ناگزیر ہو تو میت کے خاندان سے باقاعدہ اجازت لی جاتی ہے۔

جنازہ دن کے گیارہ یا پانچ بجے کے قریب گھر سے اٹھایا جاتا ہے اس سے قبل گاؤں کا پیش امام یا کوئی عمر رسیدہ شخص میت کو گھر میں غسل دیتا ہے۔ زنانہ میت کی صورت میں کوئی عورت گھر میں غسل دیتی ہے۔ میت کو کفن پہنایا جاتا ہے اور عورتوں کی اندوہناک چیخ وپکار میں جنازہ گھر سے اٹھایا جاتا ہے اور حجرے میں موجود افراد بھی جنازے کی جلوس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لوگ باری، باری جنازے کو کندھا دیتے ہیں اور راہگیر بھی احتراماً رک کر کچھ فاصلے تک جنازے کو کندھا دیتے ہیں۔ نماز جنازہ قبرستان میں پڑھائی جاتی ہے اور کفن دفن کے بعد غربا اور مساکین میں کچھ رقم تقسیم کی جاتی ہے جسے اسقاط کہتے ہیں۔ اس موقع پر مرحوم کی مغفرت کیلئے خصوصی دعائیں مانگی جاتی ہیں جس جگہ میت کو غسل دیا جاتا ہے وہاں کم از کم تین یا سات راتوں تک دیا، لالٹین یا موم بتیاں جلائی جاتی ہیں۔

باب یازدہم

ثمرات آزادی

آفریدی پیدائشی طور پر حریت پسند، جری اور جفا کش ہیں۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں انہوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کیلئے ہر جارح قوم کا مقابلہ پامردی کے ساتھ کیا اور کبھی مفتوح قوم کی حیثیت سے رہنا گوارہ نہیں کیا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل جب سکھ حکمرانوں نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں پے در پے کامیابیوں کے بعد درہ کوہاٹ کا رخ کیا تو آدم خیل قبائل اپنی زنگ آلود تلواریں، نیزے اور دقیانوسی اسلحہ لے کر ان کے مقابلے پر اتر آئے اور اپنی بے مثال جرات اور ایمانی قوت سے حملہ آور سکھ فوج پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ افراتفری کے عالم میں پسپائی پر مجبور ہوگئی۔ اس معرکہ آرائی کا حال اللہ بخش یوسفی یوں بیان کرتے ہیں "آفریدیوں نے انہیں (سکھوں) لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کیا۔ ہزاروں سکھ لقمہ اجل بن گئے اور سکھ لشکر بے ترتیبی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ سکھ وقار کو سخت ٹھیس لگی تو جذبہ انتقام سے جل کر انہوں نے اپنے مشہور اطالوی جرنیل ایوی ٹابائل المعروف ابوطبیلہ کی سر کردگی میں مزید لشکر بھیجا۔ چنانچہ اس لشکر کے ایک حصہ نے درہ کوہاٹ میں داخل ہو کر موضع آخور کو برباد کر دیا اور دوسرے لشکر نے معہ چار عدد توپوں کے علاقہ بوڑے کی راہ لی لیکن آفریدیوں نے اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ سکھوں کے پاؤں اکھڑ گئے[1]"۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آدم خیل آفریدی اپنی آزادی کے تحفظ میں کامران اور سکھ ان کو زیر نگیں کرنے کی کوششوں میں ناکام رہے۔ اس لڑائی کے بعد علاقہ آفریدی ان اربابوں اور ملکوں کیلئے پناہ گاہ ثابت ہوا جو مالیہ کی ادائیگی میں ناکامی پر خالصہ دربار کے غیض وغضب سے بچنے کی خاطر افریدیوں کے پہاڑوں کی جانب رخ کیا کرتے تھے[2]۔ اسی

طرح علاقہ آدم خیل ان لوگوں کیلئے بھی پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا جو انگریزوں کے ظلم وستم سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور تھے۔

آفریدیوں کا آزادی سے والہانہ لگاؤ اور دین اسلام سے گہری وابستگی کا عملی مظاہرہ جنگ عظیم اول کے دوران اس وقت دیکھنے میں آیا جب انگریزی فوج میں خدمات انجام دینے والے آفریدیوں نے اپنے مسلمان ترک بھائیوں کے خلاف لڑنے سے انکار کیا۔ اس جرم کی پاداش میں ان کو سزائیں دی گئیں اور فوج اور ملیشیا میں ان کی بھرتی پر پابندی لگادی گئی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جب برصغیر میں خلافت اور ہجرت کی تحریکیں شروع ہوئیں تو آدم خیل قبائل نے ان قومی تحریکات میں حصہ لیا۔ تحریک آزادی کے متوالوں کو مسلح کرنے کی غرض سے انہوں نے زیادہ اسلحہ بنانا شروع کیا اور یوں ان تحریکوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ تحریک خلافت کے سرگرم کارکنوں میں شیرا کی کے صوبیدار کاونڑ خان آفریدی کا نام سر فہرست ہے جنہیں تحریک خلافت سے وابستگی کے الزام میں سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کی ترغیب پر ۲۵ اگست ۱۹۲۰ء کو ۲۵ شیرا کی خاصہ داروں نے استعفیٰ دیا۔ انہوں نے حکومت کے خلاف ایک جلوس نکالا کوہاٹ کے گلی کوچوں کا گشت کیا حکومت کے خلاف نعرے لگائے اور لوگوں پر واضح کیا کہ وہ انگریزوں کی ملازمت نہیں کریں گے[3]۔ انہوں نے کوہاٹ شہر سے کوتل پوسٹ تک پیدل مارچ کیا اور اسی دوران اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگاتے رہے۔ اس کے بعد ۱۳ اکتوبر کو جواکی قبائل نے انگریز کی ملازمت کو خیر باد کہا اور ۱۴ نومبر کو بوستی خیل خاصہ داروں نے بھی استعفے پیش کئے۔ ایک انگریز افسر کی نظروں میں صوبیدار کاونڑ خان قبائلی علاقہ میں تحریک خلافت کا ایجنٹ تھا اور وہ انگریزوں کے خلاف آدم خیل قبائل کے جذبات ابھارنے اور ان میں بے چینی پھیلانے کے ذمہ دار تھے۔ اس نے غصے کے عالم میں چیف کمشنر کو لکھا کہ زرغون خیل

درہ آدم خیل کی سرکردہ شخصیت۔ ملک اسلم خان آفریدی
سابق ایم۔ این۔ اے

کے ملک سرمست، (آ) عبدالخالق، (ب) درے خان اور سمند خان (ج) نے کاونز خان سے مراسم استوار کئے ہیں لہذا ان میں سے ہر ایک سے ایک ایک ہزار روپے جرمانہ وصول کیا جائے۔ اگر ملک سرمست زرغون خیل جرمانہ کی ادائیگی میں لیت ولعل سے کام لے تو پھر علاقہ سرکار (شیر کیرہ) میں اس کے بھائی کے املاک پر قبضہ کیا جائے۔[۴] ۲۵ جولائی ۱۹۲۰ء کو تحریک خلافت کے ایک سرگرم کارکن مولوی عبدالغفار جب درہ تشریف لائے تو ملک سرمست زرغون خیل اور دیگر قبائلی زعماء نے انگریزوں کی خواہش کے برعکس اس کو خوش آمدید کہا اور تحریک خلافت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے معاملات پر ان کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ اگرچہ آدم خیل آفریدی بحیثیت مجموعی ہجرت اور خلافت کے تحریکات میں شرکت نہ کر سکے تاہم وہ انفرادی حیثیت میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور ان پر حملے بھی کرتے رہے۔ ایسے ہی حملوں میں نومبر ۱۹۲۰ء میں کوہاٹ میں کرنل فوکس بمعہ بیوی کے قتل کردئے گئے اور پھر اپریل ۱۹۲۳ء میں کوہاٹ چھاؤنی سے مس ایلس کو اغوا کیا گیا۔ انہی واقعات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شہزادہ خان نے ایک ملاقات میں بتایا کہ انہوں نے تحریک آزادی کے محبوس

(آ) ملک سرمست خان، زرغون خیل ملک فیروز خان کے فرزند تھے وہ اپنے والد کے وفات کے بعد اہل فیروز کے سربراہ بنے۔

(ب) ملک عبدالخالق، میری خیل کے ایک اہم ملک تھے اور شہیدہ تالاب کے قریب گاؤں انہی کے نام پر مشہور ہے۔ اسی طرح ملک درے خان بھی مانی کلی کے سرکردہ ملک تھے۔

(ج) ملک سمند خان، زرغون خیل کے بارسوخ ملک تھے۔ وہ سابقہ ایم۔ این۔ اے ملک اسلم خان کے دادا تھے۔